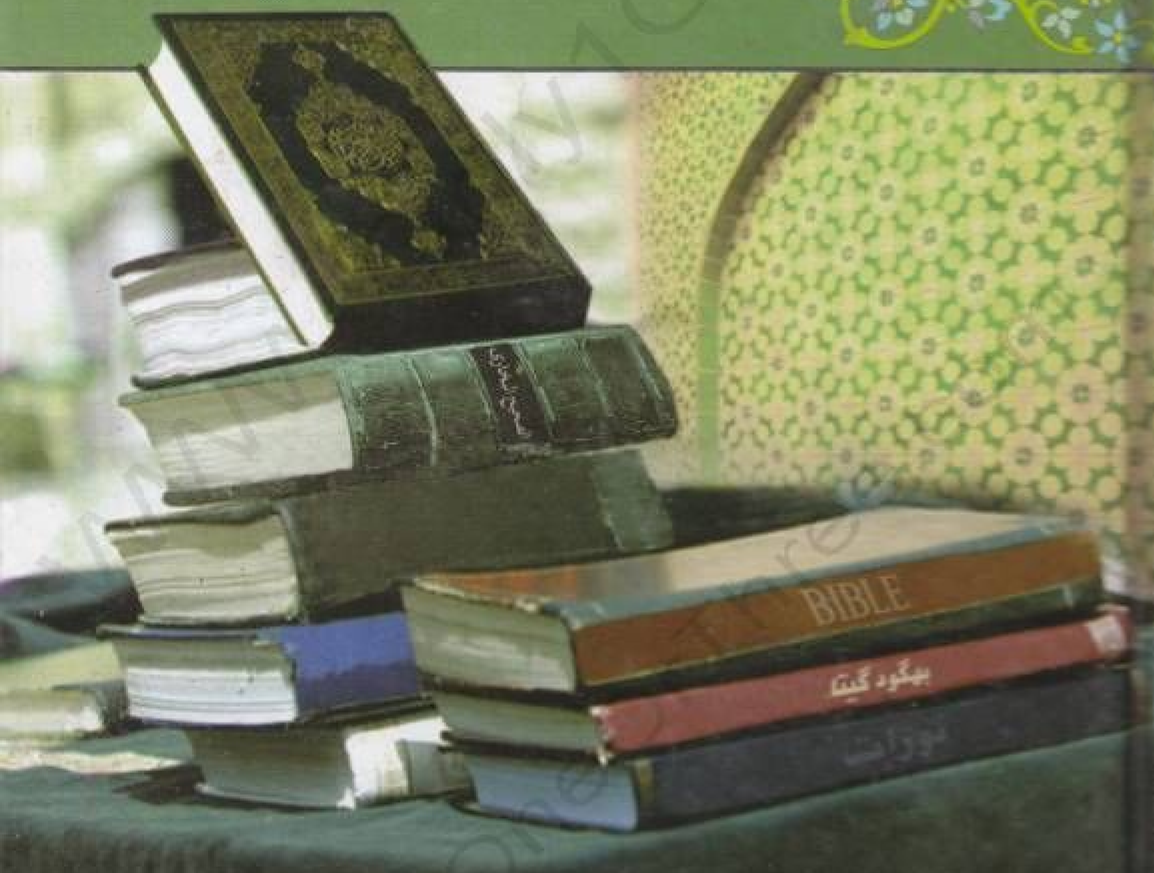
خطبات ڈاکٹر ذاکر نائیک



ڈاکٹر ذاکر نائیک

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خطبات ڈاکٹر ذاکر نائیک

مکمل اور مستند ترجمہ کے ساتھ

مترجم

سیّد امتیاز احمد

دارُالنوادر

الحمد مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور

۱۴۲۹ ہجری ۲۰۰۸ء

کتاب : خطبات ڈاکٹر ذاکر نائیک

مصنف : ڈاکٹر ذاکر نائیک

مترجم : سید امتیاز احمد

اہتمام : دار النوادر، لاہور

مطبع : میٹرو پرنٹرز، لاہور

صفحات : ۸۳۲

بائبل اور قرآن

جدید سائنس کی روشنی میں

ڈاکٹر ذاکر نائیک

مترجم

سید امتیاز احمد

دار النوادر

الحمد مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

ترتیب

حصہ اوّل

حصہ دوم

☆..........☆..........☆

خطاب

ڈاکٹر ولیم کیمپبل

سب سے پہلے تو میں ڈاکٹر ذاکر نائیک کو خوش آمدید کہنا چاہوں گا کہ وہ اتنی دور تشریف لائے۔ میں سہیل احمد، محمد نائیک اور منتظمہ کمیٹی کے اراکین کو بھی خوش آمدید کہتا ہوں۔ آج کے مکالمے کو ''The Ultimate Dialogue'' کا عنوان دینا تو خیر مبالغہ ہوگا، لیکن بات یہ ہے کہ اس طرح ذرا مشہوری اچھی ہو جاتی ہے۔ میں جملہ حاضرین کو بھی اس تقریب میں خوش آمدید کہتا ہوں۔

میں ''یہوواہ'' کے نام پر خوش آمدید کہتا ہوں، جو ہمارا عظیم خالق ہے اور ہم سب سے محبت کرتا ہے۔

سب سے پہلے میں ''الفاظ'' کے بارے میں گفتگو کرنا چاہوں گا۔ آج ہم سب یہاں الفاظ ہی کے بارے میں بات کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ بائبل کے الفاظ کے بارے میں اور قرآن کے الفاظ کے بارے میں......

جدید علم لسانیات کے ماہرین ہمیں بتاتے ہیں کہ کسی لفظ، فقرے یا جملے کے معانی وہی ہوتے ہیں جو بولنے والا مراد لیتا ہے یا جو سننے والا فرد یا افراد مراد لیتے ہیں۔

گویا قرآن کے الفاظ کے معانی وہی ہوں گے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم مراد لیتے تھے یا ان کی بات سننے والے مراد لیتے تھے۔ بائبل کے معاملے میں ''الفاظ'' کے معنی وہی ہوں گے جو حضرت عیسیٰ اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کے نزدیک تھے یا ان کے مخاطبین مراد لیتے تھے۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے اور پرکھنے کے لیے پوری بائبل اور پورا قرآن دونوں کتب

ایک تناظر فراہم کرتے ہیں، مزید برآں اس دور کے ادب اور شاعری سے بھی مدد ملتی ہے۔ یعنی انجیل کے معاملے میں پہلی صدی عیسوی کا ادب اور قرآن کے معاملے میں پہلی صدی ہجری کا ادب اور شاعری ہماری مدد کرتے ہیں۔

اگر ہم حقیقت کی پیروی کرنا چاہتے ہیں، اگر ہم سچائی کے متلاشی ہیں تو ہمیں الفاظ کو نئے معانی پہنانے سے گریز کرنا چاہیے۔ اگر ہم حقیقت کی تلاش میں سنجیدہ ہیں تو کسی ''جائز غلط بیانی'' کی کوئی گنجائش نہیں ہوگی۔

میں ایک مثال کی مدد سے اپنی بات واضح کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

میرے پاس دو ڈکشنریاں ہیں، ایک کا سنہ اشاعت ۱۹۵۱ء ہے اور دوسری کا ۱۹۹۱ء۔ یہ دونوں لغات میرے گھر میں موجود ہیں۔ میں ان دونوں میں ایک لفظ ''Pig'' کے معانی دیکھتا ہوں۔

پہلا معنی ہے ''کسی بھی جنس کا جوان خنزیر'' اور یہ معنی دونوں لغات میں موجود ہے۔
دوسرا معنی ''کسی بھی نوع کا جنگلی یا پالا ہوا خنزیر'' بھی دونوں جگہ موجود ہے۔
تیسرا معنی ''خنزیر کا گوشت'' بھی دونوں لغات میں موجود ہے۔
چوتھے معانی ''سور جیسی عادات والا شخص یا بہت زیادہ کھانے والا شخص'' بھی دونوں لغات میں پائے جاتے ہیں۔

لیکن آخر میں اس لفظ کے ایک نیا معنی بھی موجود ہے جو صرف نئی چھپنے والی لغت میں ہی موجود ہے۔ اور وہ ہے ''پولیس والا''۔ گویا جدید لغت کے مطابق یہ لفظ پولیس والوں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ توارۃ میں کہا گیا...... "You can not eat Pigs."

تو اگر میں اس جملے کا یہ معنی مراد لوں کہ یہاں Pig سے مراد پولیس والا ہے اور یہ کہ یہاں پولیس والوں کا گوشت کھانے سے منع کیا جا رہا ہے تو کیا یہ درست ہوگا؟ ظاہر ہے کہ ہرگز نہیں۔ اسی طرح قرآن میں بھی لحم خنزیر کھانے سے منع کیا گیا ہے، کیا وہاں میں یہ کہہ

سکتا ہوں کہ Pig سے مراد ''پولیس والا'' ہے؟ نہیں کیوں کہ ایسا کہنا غلط ہوگا، احمقانہ ہوگا بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ یہ ایک سفید جھوٹ ہوگا۔ کیوں کہ محمد ﷺ یا موسیٰ علیہ السلام اس لفظ سے کبھی بھی ''پولیس والا'' مراد نہیں لے سکتے تھے۔

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہمیں الفاظ کے نئے معانی مراد لینے سے پرہیز کرنا چاہیے۔ انجیل کے معاملے میں الفاظ کے وہی معانی سامنے رکھنے چاہئیں جو پہلی صدی عیسوی میں تھے۔ اسی طرح قرآن کے الفاظ کو بھی انھی معانی میں استعمال ہونا چاہیے جن معانی میں یہ پہلی صدی ہجری کے دوران میں استعمال ہوتے رہے ہیں۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن ''علم جنینیات'' Embryology کے بارے میں کیا کہتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جنین کے مختلف مراحل میں ارتقا کا نظریہ ایک جدید نظریہ ہے اور یہ کہ قرآن ہمیں ان مراحل کی خبر دیتا ہے۔

ڈاکٹر کیتھ مور اپنے کتابچے ''Highlights of Human Embryology'' میں لکھتے ہیں:

> ''یہ حقیقت کہ جنین کا ارتقا مختلف مراحل میں ہوتا ہے، پندرھویں صدی عیسوی تک واضح نہیں ہوئی تھی۔''

ہم اس دعوے کو پرکھنے کے لیے ایک تو قرآن میں استعمال ہونے والے عربی لفظ کا تجزیہ کریں گے اور دوسرا ہم قرآن سے وابستہ تاریخی حالات کا جائزہ لیں گے۔ ہم شروع کرتے ہیں عربی کے لفظ ''علقہ'' سے جو قرآن میں استعمال ہوا ہے۔ قرآن میں یہ لفظ واحد علقۃٌ اور جمع ''علق'' دونوں صورتوں میں چھ بار استعمال ہوا ہے۔

سورۂ قیامۃ میں ہم پڑھتے ہیں:

﴿اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى ۝ اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى ۝ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰى ۝ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ۝﴾

[القيامة: ۳۹-۳۶]

''کیا انسان نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ یونہی مہمل چھوڑ دیا جائے گا؟ کیا وہ ایک حقیر پانی کا نطفہ نہ تھا جو (رحم مادر میں) ٹپکایا جاتا ہے؟ پھر وہ ایک لوتھڑا بنا، پھر اللہ نے اس کا جسم بنایا اور اس کے اعضا درست کیے، پھر اس سے مرد اور عورت کی دو قسمیں بنائیں۔''

اسی طرح سورۂ مومن میں تحریر ہے:

﴿هُوَ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ يُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ثُمَّ لِتَكُوْنُوْا شُيُوْخًا ۚ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى مِنْ قَبْلُ وَلِتَبْلُغُوْٓا اَجَلًا مُّسَمًّى وَّلَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝﴾

[المؤمن: ٦٧]

''وہی تو ہے جس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفے سے، پھر خون کے لوتھڑے سے، پھر وہ تمھیں بچے کی شکل میں نکالتا ہے، پھر تمھیں بڑھاتا ہے تاکہ تم اپنی پوری طاقت کو پہنچ جاؤ، پھر اور بڑھاتا ہے تاکہ تم بڑھاپے کو پہنچو اور تم میں سے کوئی پہلے ہی بلا لیا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ اس لیے کیا جاتا ہے تاکہ تم اپنے مقررہ وقت تک پہنچ جاؤ اور اس لیے کہ تم حقیقت کو سمجھو۔''

سورۂ حج میں کہا گیا ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِىْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ ۭ وَنُقِرُّ فِى الْاَرْحَامِ مَا نَشَاۗءُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ۚ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـــًٔا ۭ﴾

[الحج: ٥]

''لوگو! اگر تمھیں زندگی بعدِ موت کے بارے میں کچھ شک ہے تو تمھیں معلوم

ہو کہ ہم نے تمھیں مٹی سے پیدا کیا ہے، پھر نطفے سے، پھر خون کے لوتھڑے سے پھر گوشت کی بوٹی سے، جو شکل والی بھی ہوتی ہے اور بے شکل بھی (یہ ہم اس لیے بتا رہے ہیں) تا کہ تم پر حقیقت واضح کریں، ہم جس (نطفے) کو چاہتے ہیں ایک وقت خاص تک رحموں میں ٹھہرائے رکھتے ہیں، پھر تم کو ایک بچے کی صورت میں نکال لاتے ہیں (پھر تمھیں پرورش کرتے ہیں) تا کہ تم اپنی جوانی کو پہنچو۔ اور تم میں سے کوئی پہلے ہی واپس بلا لیا جاتا ہے اور کوئی بدترین عمر کی طرف پھیر دیا جاتا ہے تا کہ سب کچھ جاننے کے بعد پھر کچھ نہ جانے۔"

اور پھر سورۂ مومنون میں یہ بیان بھی موجود ہے:

﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن سُلَالَةٍ مِّن طِينٍ ٥ ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ ٥ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَامًا فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا ثُمَّ أَنشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ٥﴾ [المومنون: ١٤-١٢]

"ہم نے انسان کو مٹی کے ست سے بنایا، پھر اسے ایک محفوظ جگہ ٹپکی ہوئی بوند میں تبدیل کیا، پھر اس بوند کو لوتھڑے کی شکل دی، پھر لوتھڑے کو بوٹی بنا دیا، پھر بوٹی کی ہڈیاں بنائیں پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا، پھر اسے ایک دوسری ہی مخلوق بنا کر کھڑا کیا۔ پس بڑا ہی بابرکت ہے اللہ، سب کاریگروں سے اچھا کاریگر۔"

اور یہاں وہ مراحل ہمارے سامنے آتے ہیں جو قرآن میں بیان کیے گئے ہیں، یہ مراحل مندرجہ ذیل ہیں:

نُطْفَةً	نطفہ
عَلَقَةً	لوتھڑا
مُضْغَةً	بوٹی

عِظٰمًا   ہڈیاں

اور آخری مرحلہ ہڈیوں پر گوشت چڑھنے کا۔

گزشتہ سو سال کے عرصے میں لفظ ''علقہ'' کے بہت سے تراجم ہوئے ہیں، دس ترجمے یہاں موجود ہیں۔ تین فرانسیسی ترجمے، پانچ انگریزی ترجمے، ایک انڈونیشین زبان میں اور ایک پارسی زبان میں۔ ان تراجم میں لفظ علقہ کا ترجمہ لوتھڑا یا خون کا لوتھڑا یا جونک کی طرح کا لوتھڑا کیا گیا ہے۔

ان تراجم سے ہر وہ قاری جس نے انسانی افزائش نسل کے عمل کا مطالعہ کر رکھا ہے، اندازہ کر سکتا ہے کہ جنین کی تشکیل کے دوران ایسا کوئی مرحلہ نہیں ہوتا جہاں جنین کی صورت لوتھڑے کی مانند ہو۔ لہٰذا یہ ایک نہایت اہم سائنسی مسئلہ ہے۔ اس لفظ کو اگر آپ لغت میں دیکھیں تو اس کے معنی صرف لوتھڑا یا جونک ہو سکتے ہیں۔ شمالی افریقہ میں یہ لفظ انہی معنوں میں آج بھی مستعمل ہے۔ میرے پاس ایسے مریض آتے رہے ہیں جو یہ الفاظ استعمال کرتے تھے۔ ایسی خواتین بھی آتی رہیں جو کہتی تھیں کہ حیض کا آغاز وقت پر نہیں ہوا۔ میں انھیں کہتا تھا کہ میں آپ کو حیض جاری کرنے والی ادویات نہیں دے سکتا کیوں کہ میرے خیال میں یہ حمل ہے۔

وہ کہتی تھیں کہ نہیں ''ابھی خون ہی ہے''۔ یعنی وہ اس قرآنی تصور کو سمجھ رہی تھیں۔ آخر میں ہمیں قرآن کی سب سے پہلے نازل ہونے والی آیات کو بھی سامنے رکھنا چاہیے۔ جو (حضرت) محمد ﷺ پر مکہ میں نازل ہوئیں۔ یہ آیات قرآن کی سورۃ نمبر ۹۶ میں موجود ہیں۔ اس سورۃ کا نام ہی سورۃ العلق ہے۔ یعنی وہ لفظ جس کا ہم یہاں مطالعہ کر رہے ہیں۔ اس سورۃ میں کہا گیا ہے:

﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝﴾

[العلق: ۲-۱]

''پڑھو (اے نبی ﷺ!) اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا۔ جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی۔''

لفظ کی اس صورت یعنی ''علق'' کے دیگر معانی بھی ممکن ہیں۔ مثلاً چپکنا، لٹکنا، چمٹنا وغیرہ۔ لیکن مذکورہ بالا دس تراجم میں سے کسی ایک میں بھی یہ معانی مراد نہیں لیے گئے۔ ان سب نے اس آیت میں بھی لفظ ''علق'' کا ترجمہ لوتھڑا یا ''جما ہوا خون'' ہی کیے ہیں۔

ان مترجمین کی تعداد اور صلاحیتوں کے باوجود فرانسیسی ڈاکٹر مورس بوکائیے ان کے لیے سخت الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''...... ایک اور چیز جو قاری کو گمراہ کر سکتی ہے، وہ لفظوں کا انتخاب ہے۔ مثال کے طور پر مترجمین کی اکثریت انسان کی پیدائش کی وضاحت کرتے ہوئے خون کے لوتھڑے کا ذکر کرتی ہے۔ ''انسانی افزائش نسل'' کے شعبے میں مہارت رکھنے والے ماہرین کے لیے اس قسم کا بیان ناقابل قبول ہوگا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ افزائش سے متعلقہ قرآنی آیات کی درست تفہیم کے لیے زبان کے علم کے ساتھ ساتھ سائنسی علوم سے کام لینا کس قدر ضروری ہے۔''

گویا بالفاظِ دیگر ڈاکٹر بوکائیے کہنا چاہتے ہیں کہ؛

''آج تک قرآن کے جتنے تراجم ہوئے، سب غلط تھے اور اب میرا نقطہ نظر درست ہے۔''

ڈاکٹر بوکائیے نے یہ کس طرح فرض کر لیا کہ ترجمہ وہ ہونا چاہیے جو وہ خود کر رہے ہیں۔ وہ ''علق'' کا ترجمہ بجائے ''لوتھڑے'' کے ''چپکنے والی چیز'' کرتے ہیں۔ اور اس سے مراد جنین لیتے ہیں جو آنول نال کے ذریعے رحم سے جڑا ہوتا ہے۔ لیکن جو خواتین صاحب اولاد ہیں، وہ میری اس بات کی تائید کریں گی کہ جو چیز چپکی ہوئی ہوتی ہے وہ ساڑھے آٹھ ماہ تک چپکی ہی رہتی ہے، یعنی چپکی ہوئی چیز تبدیل ہو کر ''چبائے ہوئے گوشت'' نما کسی چیز میں تبدیل نہیں ہوتی۔ تیسری بات ان آیات میں یہ کہی گئی ہے کہ؛

''بوٹی ہڈیوں میں تبدیل ہوتی ہے اور پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا جاتا ہے۔''

اس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ پہلے ڈھانچا تیار ہوتا ہے اور پھر اس پر گوشت چڑھایا جاتا

ہے۔ ڈاکٹر بوکائیے بہ خوبی جانتے ہیں کہ ایسے نہیں ہوتا۔ پٹھے اور ہڈیاں ایک ہی وقت میں بننا شروع ہوتے ہیں، آٹھویں ہفتے کے اختتام تک بہت کم ہڈیوں کی تشکیل ہوئی ہوتی ہے لیکن پٹھے حرکت کے قابل ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر T.W.Sadler جو کہ Embryo Anatomy کے ایسوسی ایٹ پروفیسر ہیں۔ Longman's Medical Embryology کے مصنف ہیں، ایک خط میں تحریر کرتے ہیں کہ:

''آٹھویں ہفتے تک پسلیاں وغیرہ اپنی ابتدائی حالت میں ہوتی ہیں اور انھوں نے ہڈیوں کی صورت اختیار نہیں کی ہوتی، جب کہ پٹھے بن چکے ہوتے ہیں۔ اس موقع پر ہڈیوں کی تشکیل کا آغاز ہی ہوا ہوتا ہے جب کہ پٹھے حرکت بھی کرسکتے ہیں۔''

دو گواہیاں ہمیشہ ایک سے بہتر ہوتی ہیں۔ لہٰذا ہم دوسری گواہی ڈاکٹر کیتھ مور کی کتاب The Developing Human سے پیش کرنا چاہتے ہیں۔ کتاب کے باب نمبر ۱۵ اور ۱۷ سے ہمیں یہ معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

(یہاں کچھ سائنسی تفاصیل بیان کرنے کے بعد ڈاکٹر ولیم کہتے ہیں:)

ایک ملاقات کے دوران میں نے ڈاکٹر مور کو ذاتی طور پر ڈاکٹر ساڈلر کا بیان دکھایا اور انھوں نے اسے بالکل درست قرار دیا۔ اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایسا کوئی مرحلہ نہیں ہوتا جس میں ہڈیاں بن چکی ہوں اور پھر ان کے اوپر پٹھے بن رہے ہوں۔ پٹھے تو ہڈیوں کے بننے سے کئی دن پیش تر ہی موجود ہوتے ہیں اور ہڈیوں کے بننے کے بعد نہیں بنتے جیسا کہ قرآن کہتا ہے۔ قرآن کا بیان یہاں بالکل غلط ہے۔[1] گویا مسئلہ ابھی حل ہونے سے بہت دور ہے۔

ہم دوبارہ لفظ ''علق'' کی طرف لوٹتے ہیں۔ ڈاکٹر مور، یہ بھی کہتے ہیں کہ قرآن کی ایک

---

(۱) نقل کفر، کفر نہ باشد۔

دوسری آیت میں جونک نما شکل کا ذکر کیا گیا ہے اور چبائی ہوئی شکل کا۔ وہ اس سے ۲۳ دن اور ۳۰ دن عمر کا جنین مراد لیتے ہیں۔ ۲۳ دن کے جنین کا سائز ۳ ملی میٹر ہوتا ہے یعنی ایک انچ کا آٹھواں حصہ۔ اس کی تصویر ڈاکٹر مور کی کتاب میں دی گئی ہے...... مجھے تو یہ کسی طرح بھی جونک نما معلوم نہیں ہوتی۔

لفظ ''علقہ'' کے ان معانی کے ساتھ سب سے بڑا مسئلہ تو یہ ہے کہ کوئی ایسی مثال عربی زبان سے پیش نہیں کی گئی جس سے اس لفظ کا ان معنوں میں استعمال ثابت ہوتا ہو۔ ابتدائی ہجری صدیوں سے ایسی مثال پیش کی جانی چاہیے۔ یہ ثابت کرنے کا کہ لفظ عَلَق کا مطلب ایک تین ملی میٹر طویل جنین ہوتا ہے جو کہ چپکا ہوا ہوتا ہے، ایک ہی طریقہ ہے کہ پیغمبر ﷺ کے دور کے زبان و ادب میں سے خصوصاً اس عربی سے جو قریش بولتے تھے، کوئی مثال پیش کی جائے۔

ایسی مثال پیش کرنا آسان نہیں ہوگا۔ قریش کی عربی پر بہت سی تحقیقات ہو چکی ہیں۔ دورِ اوّل کے مسلمانوں کے لیے عربی زبان پر تحقیق ضروری تھی کیوں کہ وہ قرآنی الفاظ کے درست معانی جاننا چاہتے تھے اور اسی وجہ سے انھوں نے اپنی زبان اور شاعری کی طرف بہت توجہ دی۔

یہی وجہ ہے کہ ۱۹۸۵ء میں ہونے والی ایک کانفرنس میں پیرس کی جامع مسجد کے سابق امام ابوبکر نے یہ سوال اٹھایا تھا:

''کیا قرآن کی تفہیم پیغمبر اسلام ﷺ کے دور سے آج تک ہمیشہ یکساں طور پر ہوتی رہی ہے؟''

اور ان کا جواب تھا:

''دورِ جاہلیت کی شاعری کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ، ہاں!''

اس سے ہم یہی نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اگر وہ آیات، جو ہمیشہ مسلمانوں کو روحانی سکون اور امید فراہم کرتی رہی ہیں، آج بھی اسی طرح ہیں تو پھر ان آیات میں موجود سائنسی

بیانات بھی اسی طرح برقرار ہیں۔ جب تک کوئی نیا ثبوت سامنے نہ آجائے۔ یہ بات نہایت اہم ہے، کیوں کہ بعض آیات میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ معلومات ایک نشانی ہیں۔ جیسا کہ ہم نے پہلے دیکھا، سورۂ مومنون میں کہا گیا ہے:

﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن سُلَالَةٍ مِّن طِينٍ ۝ ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ ۝ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَامًا فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا ثُمَّ أَنشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ ۝﴾ [المومنون: ۱۴۔۱۲]

''ہم نے انسان کو مٹی کے ست سے بنایا، پھر اسے ایک محفوظ جگہ ٹپکی ہوئی بوند میں تبدیل کیا، پھر اس بوند کو لوتھڑے کی شکل دی، پھر لوتھڑے کو بوٹی بنادیا، پھر بوٹی کی ہڈیاں بنائیں، پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا، پھر اسے ایک دوسری ہی مخلوق بنا کر کھڑا کیا۔ پس بڑا ہی بابرکت ہے اللہ، سب کاریگروں سے اچھا کاریگر۔''

اسی طرح سورۂ حج میں کہا گیا:

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِن كُنتُمْ فِي رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَإِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن تُرَابٍ ثُمَّ مِن نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِن مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ وَنُقِرُّ فِي الْأَرْحَامِ مَا نَشَاءُ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوا أَشُدَّكُمْ وَمِنكُم مَّن يُتَوَفَّىٰ وَمِنكُم مَّن يُرَدُّ إِلَىٰ أَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِن بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا﴾

[الحج: ۵]

''لوگو! اگر تمھیں زندگی بعدِ موت کے بارے میں کچھ شک ہے تو تمھیں معلوم ہو کہ ہم نے تمھیں مٹی سے پیدا کیا ہے، پھر نطفے سے، پھر خون کے لوتھڑے سے، پھر گوشت کی بوٹی سے، جو شکل والی بھی ہوتی ہے اور بے شکل بھی (یہ ہم

اس لیے بتا رہے ہیں) تا کہ تم پر حقیقت واضح کریں، ہم جس (نطفے) کو چاہتے ہیں ایک وقت خاص تک رحموں میں ٹھہرائے رکھتے ہیں، پھر تم کو ایک بچے کی صورت میں نکال لاتے ہیں (پھر تمھیں پرورش کرتے ہیں) تا کہ تم اپنی جوانی کو پہنچو۔ اور تم میں سے کوئی پہلے ہی واپس بلا لیا جاتا ہے اور کوئی بدترین عمر کی طرف پھیر دیا جاتا ہے تا کہ سب کچھ جاننے کے بعد پھر کچھ نہ جانے۔''

اگر مکہ اور مدینہ کے رہنے والے لوگوں کے لیے یہ ایک واضح آیت تھی تو ''علقة'' کے لفظ کے ان کے لیے کیا معنی تھے؟ جو انھیں زندگی بعد موت پر ایمان لانے کے لیے قائل کرتے؟

جواب جاننے کے لیے ہمیں حضرت محمد ﷺ کے دور کی تاریخی صورت حال کا جائزہ لینا ہوگا۔ ہم یہ بھی دیکھیں گے کہ محمد ﷺ اور ان کے دور کے لوگ علم الجنین کے حوالے سے کیا خیالات رکھتے تھے۔ ہم Hypocrites سے آغاز کریں گے۔ غالب امکان یہ ہے کہ وہ ۴۶۰ قبل مسیح میں یونانی جزیرے Kuss میں پیدا ہوا تھا۔ اور وہ ''مراحل'' یا Stages کا نظریہ رکھتا ہے، جو کچھ یوں ہے:

اس کے خیال میں مادہ منویہ پورے بدن سے اخذ ہوتا ہے۔ یعنی ماں اور باپ دونوں کے پورے جسم سے۔ جسم کے قوی حصوں سے قوی مادہ حاصل ہوتا ہے اور ضعیف حصوں سے ضعیف مادہ۔ اس کے بعد وہ آگے بڑھتا ہے اور ماں کے جسم میں خون کے جمنے کی بات کرتا ہے۔ اس سے جنین بنتا ہے جو ایک جھلی میں لپٹا ہوتا ہے۔ مزید برآں وہ کہتا ہے کہ جنین کی پرورش ماں کے خون کے ذریعے ہوتی ہے جو ماں کے رحم تک پہنچتا ہے کیوں کہ حاملہ ہونے کے بعد حیض کا سلسلہ بند ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ گوشت بننے کا ذکر کرتا ہے اور آخر میں ہڈیوں کا ذکر کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جیسے جیسے اعضا بنتے ہیں ان کے اندر ہڈیاں بھی بنتی چلی جاتی ہیں، درخت کی شاخوں کی مانند۔

اب ہم ارسطو کی جانب آتے ہیں۔ تقریباً ساڑھے تین سو قبل مسیح میں لکھی گئی اپنی

کتاب میں ''ارتقائے جنین'' کے مراحل کا ذکر کرتا ہے۔ وہ مادۂ منویہ، حیض کے خون وغیرہ کا ذکر بھی کرتا ہے۔ کتاب کے اس حصے میں وہ نر کے مادۂ منویہ کو ''خالص'' قرار دیتا ہے۔ یعنی مادہ سے حاصل ہونے والا مادۂ منویہ وہ لوازمہ فراہم کرتا ہے جو نر کے مادۂ منویہ کو درکار ہوتا ہے۔ گویا بالفاظ دیگر مادہ منویہ ماہواری کے خون کو جمانے کا باعث بنتا ہے اور پھر اس سے گوشت بنتا ہے۔ ارسطو کہتا ہے کہ فطرت خالص ترین اجزا سے گوشت اور باقی ماندہ اجزا سے ہڈیاں تشکیل دیتی ہے۔ پہلے ہڈیاں بنتی ہیں اور پھر ان کے گرد گوشت بنتا ہے۔ بالکل یہی بات ہمیں قرآن میں بھی ملتی ہے۔ مادۂ منویہ اور خون سے لوتھڑا بنتا ہے، اس سے ہڈیاں اور پھر ہڈیوں پر گوشت۔

اب ہم ہندوستانی علم الادویہ کی طرف آتے ہیں۔ ۱۲۳ء میں Sharaka اور Shushruta کا کہنا تھا کہ:

''نر اور مادہ دونوں تخم ریزی میں حصہ لیتے ہیں۔ نر کا مادۂ منویہ Sukra اور مادہ کا Artava کہلاتا ہے۔ ان کا بھی یہی خیال تھا کہ جنین کی تشکیل مادۂ منویہ اور خون سے ہوتی ہے۔''

اب ہم گالن کے نقطۂ نظر کی طرف آتے ہیں۔ گالن کا سنہ پیدائش ۱۳۱ عیسوی ہے اور وہ اس علاقے میں پیدا ہوا تھا جو آج کل ترکی میں شامل ہے۔ گالن کا کہنا تھا کہ وہ لوازمہ جس سے جنین کی تشکیل ہوتی ہے خون اور نر و مادہ دونوں طرح کے مادہ منویہ پر مشتمل ہوتا ہے۔ قرآن یہاں گالن سے متفق ہے۔ قرآن میں کہا گیا:

﴿اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ﴾ [الدھر: ۲]

''ہم نے انسان کو ایک مخلوط نطفے سے پیدا کیا۔''

اب ہم آتے ہیں گالن کے بیان کردہ مراحل کی جانب کیوں کہ وہ بھی جنین کے ارتقا کے مختلف مراحل بیان کرتا ہے۔

پہلا مرحلہ مادہ منویہ پر مشتمل ہوتا ہے۔

دوسرا مرحلہ وہ ہوتا ہے جس میں مادہ منویہ اور خون یکجا ہوتے ہیں، یہ وہ مرحلہ ہوتا ہے جس میں مختلف اعضا نے ابھی واضح شکل اختیار نہیں کی ہوتی۔ قرآن میں یوں کہا گیا ہے:

﴿مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ﴾ [الحج: ۵]

''پھر گوشت کی بوٹی سے جو شکل والی بھی ہوتی ہے اور بے شکل بھی۔''

تیسرا مرحلہ وہ بیان کرتا ہے، جس میں ہڈیوں پر گوشت چڑھتا ہے۔ جیسا کہ ہم نے دیکھا قرآن بھی یہ مرحلہ بیان کرتا ہے:

﴿ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَامًا فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا﴾ [المومنون: ۱۴]

''پھر اس بوند کو لوتھڑے کی شکل دی، پھر لوتھڑے کو بوٹی بنایا، پھر بوٹی کی ہڈیاں بنائیں، پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا۔''

گالن کو اس زمانے میں کس قدر اہمیت حاصل تھی، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ پہلی ہجری صدی کے آغاز کے قریب اسکندریہ میں چار افراد نے علم طب کا ایک مدرسہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا تو اس کا نصاب گالن کی ۱۶ کتابوں پر مشتمل تھا۔ اور یہ کتابیں تیرھویں صدی عیسوی تک نصاب میں شامل رہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ محمد ﷺ کے دور میں خطۂ عرب کی سیاسی، معاشی اور طبی صورت حال کیا تھی؟

اس زمانے میں یمن سے تجارتی قافلے مکہ اور مدینہ سے ہوتے ہوئے شمال کی طرف جایا کرتے تھے۔ توارۃ کا عبرانی سے Cyriac زبان میں ترجمہ ہوچکا تھا جو آرامی زبان کی ایک قسم ہے اور عربی سے مشابہ ہے۔ یہ ترجمہ سنہ ۴۶۳ء میں ہی ہوچکا تھا۔ برٹش میوزیم میں اس کی ایک نقل موجود ہے۔ سنہ ۵۰۰ء کے بعد عرب کے شمالی صحراؤں میں یہی زبان بولی جاتی تھی۔ اور ان علاقوں میں رہنے والے عیسائی اور یہودی قبائل کے پاس توارۃ اسی زبان میں دستیاب تھی۔

اسی زمانے میں Syrgies Cyrra Cynie [؟] نے، جو ۵۳۶ء میں قسطنطنیہ

میں فوت ہوا، علم طب کی کئی کتابوں کا یونانی سے Cyraic زبان میں ترجمہ کیا۔ ان میں گالن کی ۲۶ کتابیں بھی شامل تھیں۔ اس طرح یہ کتابیں خسرو اوّل کی عجمی سلطنت اور قبیلہ غسان کے علاقوں میں دستیاب تھیں۔ اس قبیلے کا علاقہ اس زمانے میں مدینے کے قریب تک پہنچ چکا تھا۔ شہنشاہِ ایران کسریٰ اول کو خسروِ اعظم کہا جاتا تھا۔ اس کی افواج کی فتوحات یمن تک جا پہنچی تھیں۔ وہ علم دوست بادشاہ تھا۔ اس نے کئی مدارس بھی قایم کیے۔ ان میں جندی شاپور کا مدرسہ بھی شامل تھا۔ جو خسروِ اول کے طویل ۴۸ سالہ دور اقتدار کے دوران میں اپنے وقت کا عظیم ترین علمی مرکز بن گیا تھا۔

جندی شاپور کے مدرسے میں یونانی، یہودی، نسطوری، ایرانی اور ہندی افکار پر آزادانہ تبادلۂ خیال ہوتا تھا۔ تعلیم و تدریس زیادہ تر Syriac زبان میں ہوتی تھی۔ تراجم کے ذریعے انھیں ارسطو، گالن اور Hypocrites کے خیالات و افکار جندی شاپور کے مدرسے میں آسانی سے دستیاب تھے۔

اگلے مرحلے میں فاتح عربوں نے نسطوریوں کو مجبور کیا کہ وہ ان کتابوں کو Syriac زبان سے عربی میں ترجمہ کریں۔ ترجمہ مشکل بھی نہیں تھا کیوں کہ دونوں زبانوں کی گرامر یکساں ہے۔ جہاں تک علم طب کی مقامی صورت حال کا تعلق ہے، ہم جانتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اس خطے میں طبیب موجود تھے۔ حارث ان میں سب سے مشہور تھا۔ وہ اپنے وقت کا سب سے ماہر طبیب تھا۔ اس کا تعلق طائف کے قبیلۂ بنی ثقیف سے تھا۔ وہ چھٹی صدی عیسوی کے وسط میں پیدا ہوا تھا۔ اس نے یمن اور پھر ایران کا سفر کیا اور جندی شاپور کے مدرسے میں طب کی تعلیم حاصل کی۔ اس طرح وہ ارسطو اور گالن کے نظریات سے آگاہ ہوا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد اس نے ایران میں ہی حکمت شروع کی۔ اس دوران سے خسرو کے دربار میں بھی طلب کیا گیا۔ جہاں اس نے شہنشاہ سے طویل گفتگو کی۔

تقریباً اسلام کے آغاز کے وقت وہ خطۂ عرب میں واپس آیا اور طائف میں آباد ہو گیا۔ اس دوران یمن کا ایک بادشاہ ابوخیر کسی بیماری کے سلسلے میں اس کے پاس

طائف آیا۔ صحت یاب ہونے کے بعد اس نے حارث کو بہت سی دولت اور ایک کنیز انعام میں عطا کی۔

اگرچہ حارث نے علم طب پر کوئی کتاب نہیں لکھی لیکن کئی طبی معاملات پر اس کے خیالات خسرو سے اس کی گفتگو کی صورت میں محفوظ ہیں۔ آنکھ کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ یہ چربی سے بنی ہوتی ہے یعنی آنکھ کی سفیدی، جب کہ سیاہ حصے کو وہ پانی قرار دیتا ہے اور نظر کو وہ ''ہوا'' قرار دیتا ہے۔ آج ہم جانتے ہیں کہ یہ تمام باتیں غلط ہیں لیکن یونانی خیالات یہی تھے۔ اور اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حارث کو یونانی علما کے افکار سے آگاہی حاصل تھی۔ اس صورت حال کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے ''Dr. Lucaine la Clerk'' اپنی کتاب ''Eastword Delamitry Arabs'' میں لکھتے ہیں:

> ''حارث نے علم طب جندی شاپور میں حاصل کیا اور محمد ﷺ کو علم طب کے بارے میں معلومات جزوی طور پر حارث سے حاصل ہوئیں تھیں۔ لہٰذا دونوں کے ہاں یونانی خیالات کے آثار مل جاتے ہیں۔ محمد ﷺ بعض اوقات مریضوں کا علاج خود کرتے تھے لیکن پیچیدہ امراض کی صورت میں وہ حارث کے پاس بھیج دیا کرتے تھے۔ علم طب کا ایک اور عالم لادن بن حارث بھی تھا۔ اگرچہ اس کا طبیب حارث سے کوئی رشتہ نہیں تھا۔ وہ محمد ﷺ کا رشتہ دار تھا اور خسرو کے دربار میں حاضر ہو چکا تھا۔ بہر حال اسے محمد ﷺ سے ہمدردی نہیں تھی۔ اور وہ قرآن کے بعض بیانات پر معترض تھا۔ محمد ﷺ نے اسے معاف نہیں کیا اور جب وہ جنگ بدر میں گرفتار ہوا تو اسے سزائے موت دی گئی۔''

گفتگو کا خلاصہ کچھ یوں بنتا ہے:

- ۶۰۰ء میں مکہ اور مدینہ میں رہنے والے عربوں کے روابط حبشہ یمن، فارس اور بازنطینی سلطنت کے ساتھ قایم تھے۔

- محمد ﷺ کا ایک رشتہ دار فارسی زبان اتنی اچھی جانتا تھا کہ موسیقی کے حوالے سے اس زبان میں تحقیق کر سکے۔
- غسانی قبیلہ جو صحرائے عرب کے ایک حصے پر حکمران تھا اور جس کی سرحدیں مدینہ سے ملتی تھیں، وہی زبان بولتا تھا جو جندی شاپور کے مدرسے میں طب کی تعلیم دینے کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ یمن کا ایک بادشاہ اپنے علاج کے سلسلے میں طائف آیا تھا۔ اور طائف کے طبیب حارث کے زیر علاج رہا جس نے طب کی تعلیم جندی شاپور کے مدرسے میں حاصل کی تھی جو اس دور میں دنیا بھر میں طب کی تعلیم کا بہترین ادارہ تھا۔ محمد ﷺ بھی بعض اوقات علاج کے لیے مریضوں کو حارث کے پاس بھیجا کرتے تھے۔
- محمد ﷺ کے دور میں ہی اسکندریہ میں ایک نیا مدرسہ بھی طب کی تعلیم کے لیے قایم ہوا تھا، جس کے نصاب میں گالن کی سولہ کتابیں شامل تھیں۔ اس ذریعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس بات کے وافر امکانات موجود تھے کہ محمد ﷺ اور ان کے اصحاب ارسطو اور گالن وغیرہ کے تولیدی نظریات سے آگاہ ہو سکتے۔ جس کا ذریعہ حارث اور دیگر طبیبوں کی صورت میں موجود تھا۔

لہٰذا جب قرآن مکی دور کی آخری سورتوں میں سے ایک سورۃ میں کہتا ہے:

﴿هُوَ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ يُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ثُمَّ لِتَكُوْنُوْا شُيُوْخًا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى مِنْ قَبْلُ وَلِتَبْلُغُوْٓا اَجَلًا مُّسَمًّى وَّلَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ۝﴾

[المومن: ٦٧]

"وہی تو ہے جس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفے سے، پھر خون کے لوتھڑے سے، پھر وہ تمھیں بچے کی شکل میں نکالتا ہے، پھر تمھیں بڑھاتا ہے تا کہ تم اپنی پوری طاقت کو پہنچ جاؤ، پھر اور بڑھاتا ہے تا کہ تم بڑھاپے کو پہنچو اور تم میں سے

کوئی پہلے ہی بلا لیا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ اس لیے کیا جاتا ہے تا کہ تم اپنے مقررہ وقت تک پہنچ جاؤ اور اس لیے کہ تم حقیقت کو سمجھو۔''

اور پھر سورۂ حج میں بھی کہا گیا ہے:

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِنَ الْبَعْثِ فَإِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُضْغَةٍ مُخَلَّقَةٍ وَغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِنُبَيِّنَ لَكُمْ وَنُقِرُّ فِي الْأَرْحَامِ مَا نَشَاءُ إِلَى أَجَلٍ مُسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوا أَشُدَّكُمْ وَمِنْكُمْ مَنْ يُتَوَفَّى وَمِنْكُمْ مَنْ يُرَدُّ إِلَى أَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا ط﴾

[الحج: ۵]

''لوگو! اگر تمھیں زندگی بعدِ موت کے بارے میں کچھ شک ہے تو تمھیں معلوم ہو کہ ہم نے تمھیں مٹی سے پیدا کیا ہے، پھر نطفے سے، پھر خون کے لوتھڑے سے پھر گوشت کی بوٹی سے، جو شکل والی بھی ہوتی ہے اور بے شکل بھی (یہ ہم اس لیے بتا رہے ہیں) تا کہ تم پر حقیقت واضح کریں ہم جس (نطفے) کو چاہتے ہیں ایک وقت خاص تک رحموں میں ٹھہرائے رکھتے ہیں، پھر تم کو ایک بچے کی صورت میں نکال لاتے ہیں (پھر تمھیں پرورش کرتے ہیں) تا کہ تم اپنی جوانی کو پہنچو۔ اور تم میں سے کوئی پہلے ہی واپس بلا لیا جاتا ہے اور کوئی بدترین عمر کی طرف پھیر دیا جاتا ہے تا کہ سب کچھ جاننے کے بعد پھر کچھ نہ جانے۔''

یہاں ہم یہ سوال کرنے میں حق بجانب ہیں کہ اُن سے کیا مطالبہ کیا جا رہا تھا؟ کس بات پر غور کرنے کی دعوت دی جا رہی تھی؟ جواب بالکل واضح ہے۔ وہ وہی سمجھ رہے تھے اور اسی بات پر غور کر رہے تھے جو اس دور کا علم تھا یعنی وہ تولیدی مراحل جن کی تعلیم یونانی حکما نے دی تھی۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ محمد ﷺ کے مخاطبین ان یونانی حکما کے نام بھی جانتے تھے۔ لیکن وہ جنین کے ارتقا کے ان مراحل کے بارے میں ضرور جانتے تھے جن کے

بارے میں ان یونانی حکما نے بتایا تھا۔ وہ یہ خیال کرتے تھے کہ نر کا مادہ منویہ حیض کے خون کے ساتھ مل کر اسے جما دیتا ہے اور پھر اس سے بچہ بنتا ہے۔ وہ یہ بھی یقین رکھتے تھے کہ ایک ایسا مرحلہ بھی ہوتا ہے جس میں جنین نیم تشکیلی حالت میں ہوتا ہے۔ اور ان کا یہ بھی خیال تھا کہ پہلے ہڈیاں بنتی ہیں اور پھر ان پر گوشت چڑھتا ہے۔ اللہ ان کی معلومات کو ہی ایک نشانی کے طور پر برت رہا تھا۔ اور یوں سامعین اور قارئین کو اپنی طرف رجوع کی دعوت دے رہا تھا۔ مسئلہ یہ ہے کہ یہ معلومات درست نہیں تھیں۔

اب ہمیں محمد ﷺ کے بعد کے ادوار کے اطبا پر توجہ دینی ہوگی۔ ظاہر ہے کہ یہ اطباء قرآن پر اثر انداز نہیں ہو سکتے تھے لیکن یہ ماہرین سولھویں صدی عیسوی تک ارسطو اور گالن وغیرہ کے تصورات ہی کی پیروی کرتے رہے۔

اگر ''علقہ'' کا درست ترجمہ ''جونک نما شے'' ہے جیسا کہ بعض جدید مسلمان مفکرین مثلاً شبیر علی وغیرہ دعویٰ کرتے ہیں تو پھر ان اطبا کو بھی یہی کہنا چاہیے لیکن معاملہ اس کے برعکس تھا۔ یونانی اطبا کے نظریات کی مدد سے قرآنی بیانات کی وضاحت کی جارہی تھی اور قرآن کے ایسے معانی بیان کیے جاتے تھے جو یونانی نظریات کی تائید کرتے ہوں۔

مثلاً ابن سینا کے بقول جنین کی تشکیل دو اجزا سے ہوتی ہے۔ مردانہ مادۂ منویہ، جو عامل کا کردار ادا کرتا ہے اور دوسرے زنانہ مادۂ منویہ جو پہلے حیض کے خون کا جزو ہوتا ہے اور جو ایسا لوازمہ فراہم کرتا ہے جس سے مادہ منویہ کی تشکیل ہوتی ہے۔

یوں ہم دیکھتے ہیں کہ ابن سینا زنانہ مادۂ منویہ کو وہی کردار دیتا ہے جو ارسطو نے حیض کے خون کو دیا تھا۔ ابن سینا کو جو اہمیت اور استناد قدیم یورپ میں سائنس اور فلسفے کے حوالے سے حاصل تھا، وہ محتاجِ بیان نہیں۔

اب ہم ابن قیم الجوزیہ کی طرف آتے ہیں۔ ابن قیم نے یونانی طب اور قرآنی بیانات کی مطابقت کا پورا پورا فائدہ اٹھایا ...... وہ اپنی تصنیف ''کتاب الاجنہ'' کے تیسرے باب میں کہتا ہے:

''مادۂ منویہ ایک جھلی میں ہوتا ہے، اس کی بڑھوتری کا سبب ماں کا خون ہوتا ہے جو رحم میں پہنچتا ہے۔ کچھ جھلیاں ابتدا میں بن جاتی ہیں، کچھ دوسرے مہینے میں اور کچھ تیسرے مہینے میں۔''

جیسا کہ ہم نے پہلے دیکھا، ماں کے خون کے رحم میں جانے کی بات Hippocrates نے بھی کی ہے۔ یہی بات قران بھی کہتا ہے:

﴿يَخْلُقُكُمْ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهَاتِكُمْ خَلْقًا مِنْ بَعْدِ خَلْقٍ فِيْ ظُلُمَاتٍ ثَلَاثٍ﴾ [الزمر: ٦]

''وہ تمھاری ماؤں کے پیٹوں میں تین تین تاریک پردوں کے اندر تمھیں ایک کے بعد ایک شکل دیتا چلا جاتا ہے۔''

اس کے بعد ابن قیم اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ہر جھلی کی اپنی تاریکی ہوتی ہے اور قرآن میں خدا جب ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے تک ارتقا کا ذکر کرتا ہے تو ان تین تاریک پردوں کا ذکر بھی کرتا ہے۔

بیش تر مفسرین اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ پہلی تاریکی پیٹ کی، دوسری رحم مادر کی اور تیسری جنین پر لپٹی ہوئی جھلی کی ہوتی ہے۔

اب ہم دوسری مثال دیکھتے ہیں:

''Hippocrates کا کہنا ہے کہ منہ اچانک کھل جاتا ہے، ناک اور کان بن جاتے ہیں پھر کان کھل جاتے ہیں اور پھر آنکھیں جو ایک شفاف سیال سے بھری ہوتی ہیں ......''

جب کہ محمد ﷺ کہتے ہیں کہ:

''میں اس کی عبادت کرتا ہوں جس نے میرا چہرہ بنایا اور مجھے سماعت بخشی اور بینائی عطا کی ......''

مماثلت بالکل واضح ہے۔ ابن قیم بھی Hippocrates ہی کی بات کر رہا ہوتا ہے،

جب وہ ماں کے خون کے رحم میں جنین تک پہنچنے کا ذکر کرتا ہے۔

اور وہ ایسا کر سکتے تھے کیوں کہ، جیسا کہ ہم نے دیکھا، محمد ﷺ کے دور میں پڑھے لکھے لوگ یونانی علم الادویہ سے ناواقف نہیں تھے۔ البتہ ہمارے لیے آج کے تناظر میں اہم بات یہ ہے کہ قرآن کسی بھی جگہ یونانی علم طب کی اصلاح نہیں کرتا ہے۔ ابن قیم کسی جگہ یہ اعلان نہیں کرتا کہ ''نہیں، تم سب غلط کہہ رہے ہو، علقہ کا مطلب تو چپکنے والی چیز یا جونک نما چیز ہوتا ہے۔'' بلکہ اس کے برعکس وہ قرآن اور یونانی علم طب کی مطابقت اور مشابہت ہی ثابت کرتا ہے۔ اور ان کی یہ مطابقت غلطی پر ہے۔ یعنی وہ ایک غلطی پر متفق ہیں۔ ایک قطعی مثال بیضاوی کی تفسیر ہے۔ یہ تفسیر ۱۲۰۰ء میں لکھی گئی۔ اور یہاں اس تفسیر میں ہم دیکھتے ہیں کہ علقہ کا مطلب ''جما ہوا خون'' بتایا گیا ہے۔ پھر گوشت کی بوٹی، جس کی جسامت بس اس قدر ہوتی ہے کہ جسے چبایا جا سکے، اور اسی طرح آگے بات چلتی ہے۔

جیسا کہ میں نے ابتدا میں ذکر کیا تھا۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ جنین کے مختلف مراحل میں ارتقا کا نظریہ ایک جدید نظریہ ہے۔ اور یہ کہ قرآن نے ان مراحل کا ذکر کر کے جدید علم الجنین کی معلومات چودہ سو برس پیش تر ہی پیش کر دی تھیں۔ لیکن اس مطالعے کے دوران میں ہم نے دیکھا کہ ارسطو، قدیم ہندو اور گالن وغیرہ بھی ان مراحل کے بارے میں جانتے تھے اور انھوں نے ان مراحل پر گفتگو بھی کی ہے اور یہ قرآن سے بہت پہلے کی بات ہے۔

قرآن کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ وہی نظریات جو یونانی علما نے اور قرآن نے بیان کیے تھے، ابن سینا اور ابن قیم تک پہنچے اور بعینہ اسی طرح پہنچے جس طرح ان کی تعلیم گالن نے دی تھی۔

جہاں تک ہڈیوں کا تعلق ہے، اس حوالے سے بھی ہم نے بات کی اور جیسا کہ ڈاکٹر مور نے بڑی وضاحت سے اپنی کتاب میں بیان کیا ہے کہ پہلے پٹھے بنتے ہیں اور بیک وقت ہڈی بھی اپنی ابتدائی صورت میں تشکیل پانا شروع کر دیتی ہے۔ ایسا کوئی مرحلہ نہیں ہوتا جس

میں ہڈیوں کا ڈھانچہ تو بن چکا ہو لیکن ابھی اس پر گوشت نہ چڑھا ہو۔

اسی طرح یہ بات بھی بالکل واضح ہے کہ لفظ ''علقہ'' کے معنی ''لوتھڑا'' ہوتے ہیں اور یہ کہ محمد ﷺ نے قریش سے جو یہ کہا کہ جنین کے ارتقا میں عورت کا حصہ حیض کے خون کی صورت میں ہوتا ہے تو یہ بات ان کے لیے قابل فہم تھی۔

لہٰذا ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ قرآن کا یہ بیان کہ انسان نطفے سے اور پھر خون کے لوتھڑے سے بنتا ہے، پہلی صدی ہجری کی سائنسی صورتِ حال کے عین مطابق تھا۔ یعنی جس وقت قرآن سامنے آیا، اس وقت کی علمی سطح کے مطابق تھا۔ لیکن جب مقابلہ بیسویں صدی عیسوی کے ساتھ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ہپوقریطس غلطی پر ہے، ارسطو غلطی پر ہے، گالن غلطی پر ہے اور قرآن بھی غلطی پر ہے۔[1] یہ سب ایک بہت بڑی غلطی کر رہے تھے۔

اب ہم تھوڑا ذکر ''چاندنی'' کا کریں گے۔ کیا قرآن واقعی یہ بتاتا ہے کہ ''چاند کی روشنی، سورج کی روشنی کا انعکاس ہوتا ہے۔'' اور اس دور میں بتاتا ہے جب لوگوں کو ابھی اس بات کا علم نہیں ہوا تھا؟

سورۂ نوح میں کہا گیا ہے:

﴿اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ۝ وَّجَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا ۝﴾ [نوح: ۱۶-۱۵]

''کیا دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ نے کس طرح سات آسمان تہہ بر تہہ بنائے اور ان میں چاند کو نور اور سورج کو چراغ بنایا؟''

یہاں چاند کو ''نور'' اور سورج کو چراغ یعنی ''سراج'' کہا گیا ہے۔ کچھ مسلمانوں کا دعویٰ یہ ہے کہ چوں کہ قرآن سورج اور چاند کی روشنی کے لیے مختلف الفاظ استعمال کرتا ہے لہٰذا اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ سورج اور چاند کی روشنی مختلف قسم کی ہوتی ہے۔ سورج اپنی روشنی خارج کرتا ہے جب کہ چاند سورج کی روشنی کو منعکس کرتا ہے۔ یہ دعویٰ شبیر علی نے

(۱) نقل کفر، کفر نہ باشد۔

اپنے کتابچے میں اور ڈاکٹر ذاکر نے اپنی تقریر میں بڑے زور و شور سے کیا ہے۔ اپنی ویڈیو ''کیا قرآن کلامِ الٰہی ہے؟'' میں ذاکر نائیک واضح طور پر کہتے ہیں:

''...... چاند سے آنے والی روشنی آتی کہاں سے ہے؟ پہلے ہمارا خیال تھا کہ یہ چاند کی اپنی روشنی ہوتی ہے۔ لیکن آج سائنسی ترقی کی وجہ سے ہم جانتے ہیں کہ چاند کی روشنی اس کی اپنی نہیں ہوتی بلکہ سورج کی روشنی کا انعکاس ہوتی ہے۔ یہاں میں ایک سوال پوچھوں گا۔ قرآنِ مجید کی سورۂ فرقان میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ تَبَارَكَ الَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِیْهَا سِرَاجًا وَّقَمَرًا مُّنِیْرًا ۝ ﴾ [الفرقان: ٦١]

''بڑا متبرک ہے وہ جس نے آسمان میں برج بنائے اور اس میں ایک چراغ اور ایک چمکتا چاند روشن کیا۔''

عربی میں چاند کے لیے لفظ قمر استعمال ہوتا ہے اور اس کی روشنی کے لیے منیر کا لفظ استعمال ہوا ہے جو کہ منعکس روشنی یا ''نور'' کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ گویا قرآن یہ کہتا ہے کہ چاند کی روشنی منعکس روشنی ہے، تم کہتے ہو کہ تم نے یہ بات آج دریافت کی ہے تو پھر قرآن نے یہ بات ۱۴۰۰ برس پہلے ہی کس طرح بیان کر دی تھی؟ ......''

ہم دیکھتے ہیں کہ ڈاکٹر ذاکر نے یہاں بتایا کہ چاند کو عربی میں قمر کہتے ہیں اور اس کی روشنی کے لیے منیر کا لفظ استعمال ہوا ہے جو کہ نور یا منعکس روشنی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ڈاکٹر ذاکر نے واضح طور پر نور کو منعکس روشنی قرار دیا ہے۔ ان کا یہ دعویٰ نہ صرف سائنسی حقائق کے مطابق ہونا چاہیے بلکہ اس کا ایک معجزاتی پہلو بھی ہے۔ وہ یہ کہ یہ بات کہ چاند کی روشنی منعکس ہوتی ہے نسبتاً حال ہی میں دریافت ہوئی ہے۔

یہ بات تو بالکل درست ہے کہ چاند کی روشنی اپنی نہیں ہوتی بلکہ درحقیقت سورج کی

روشنی کا انعکاس ہوتی ہے لیکن یہ بات محمد ﷺ کے دور سے ایک ہزار برس پہلے ہی معلوم تھی۔ اور یہ کوئی جدید دریافت نہیں ہے۔ ارسطو نے ۳۶۰ ق م میں ہی چاند پر زمین کا سایہ پڑنے کی بات کی تھی اور اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ زمین گول ہے۔ اور چاند پر سایہ پڑنے کی بات وہ اسی صورت میں کرسکتا تھا اگر اسے یہ علم تھا کہ چاند سے روشنی خارج نہیں ہوتی۔ اگر آپ اس کے باوجود اسے معجزہ قرار دینے پر مصر ہیں تو پھر ہمیں دیکھنا پڑے گا کہ خود قرآن سے بھی اس دعوے کی تائید ہوتی ہے یا نہیں؟

سب سے پہلے ہم لفظ ''سراج'' پر غور کریں گے۔

یہ لفظ سورہٴ نوح میں استعمال ہوا ہے جس کا حوالہ پہلے دیا گیا۔ پھر سورہٴ فرقان میں، جہاں اس کا مطلب چراغ ہے اور سورج کے لیے استعمال ہوا ہے۔ پھر سورہٴ النبا میں جہاں ﴿ سِرَاجًا وَّهَّاجًا ﴾ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ یعنی ''نہایت روشن اور گرم چراغ''۔

لفظ ''نور'' اور ''منیر'' ایک ہی مادے سے نکلے ہیں۔ لفظ منیر قرآن میں چھ مرتبہ استعمال ہوا ہے۔ سورہٴ آل عمران، سورہٴ حج، سورہٴ لقمان اور سورہٴ فاطر میں۔ ایک اصطلاح استعمال ہوئی ''کتاب المنیر'' جس کا ترجمہ پکتھال نے ''The Scripture giving Light'' اور عبداللہ یوسف علی نے ''A Book of Enlightment'' کیا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ یہاں مراد علم کی روشنی پھیلانے والی کتاب ہے اور ''منعکس روشنی'' کا کوئی ذکر نہیں۔ نور کا لفظ سورہٴ نوح اور سورہٴ یونس میں استعمال ہوا ہے۔ کہا گیا ہے کہ ''وہی ہے جس نے چاند کو نور بنایا''۔ یہاں خود چاند کو روشنی بتایا جارہا ہے اور یہ کہیں نہیں کہا گیا کہ چاند روشنی کو منعکس کرتا ہے۔

مزید برآں بعض دیگر آیات میں خود اللہ کو نور قرار دیا گیا ہے۔

مثال کے طور پر سورہٴ نور میں قرآن کا ایک خوبصورت بیان ہے جس میں کہا گیا ہے:

﴿ اللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ

مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ﴾ [النور: ۳۵]

’’اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ (کائنات میں) اس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے ایک طاق میں چراغ رکھا ہوا ہو، چراغ ایک فانوس میں ہو، فانوس کا حال یہ ہو کہ جیسے موتی کی طرح چمکتا ہوا تارا۔ اور وہ چراغ زیتون کے ایک ایسے مبارک درخت کے تیل سے روشن کیا جاتا ہو جو نہ شرقی ہو اور نہ غربی۔ جس کا تیل آپ ہی آپ بھڑکا پڑتا ہو، چاہے اس کو آگ نہ لگے۔‘‘

چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ ’’نور‘‘ کا لفظ چاند کے لیے بھی استعمال ہوا ہے اور اللہ کے لے بھی۔ تو کیا ہم یہ کہیں گے کہ اللہ کا نور بھی منعکس نور ہے؟ میرے خیال میں تو نہیں۔ لیکن اگر آپ اس پر مصر ہیں کہ ’’نور‘‘ منعکس یا ’’مانگی ہوئی روشنی‘‘ ہی کو کہتے ہیں تو پھر ہم متذکرہ بالا آیت میں دیکھ چکے ہیں کہ اللہ زمین اور آسمانوں کا نور ہے۔ تو پھر اس روشنی کا ’’سراج‘‘ یا اصل منبع کیا ہے جس کا نور اللہ ہے؟

ذرا سوچیے؟

اگر اللہ کو ’’نور‘‘ کہا گیا ہے تو پھر یہ کس روشنی کا، کس ’’سراج‘‘ کا عکس ہے؟

دیکھیے قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ ’’سراج‘‘ کون ہے؟ لیکن قرآن کا جواب آپ کو حیران کردے گا۔ سورۂ احزاب میں ہم دیکھتے ہیں:

﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۝ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ۝ ﴾ [الاحزاب: ۴۵۔۴۶]

’’اے نبی! ہم نے تمھیں بھیجا ہے، گواہ بنا کر، بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر، اللہ کی اجازت سے اس کی طرف دعوت دینے والا بنا کر اور روشن چراغ بنا کر۔‘‘

اس آیت میں محمد ﷺ کو ’’روشن چراغ‘‘ کہا گیا ہے۔ عربی میں ﴿ سِرَاجًا

مُنِيرًا﴾ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ لسانی اور روحانی ہر دو لحاظ سے یہاں بحث کا اختتام ہو جاتا ہے۔ لسانی لحاظ سے دیکھا جائے تو یہاں ''سراج'' اور ''منیر'' کے الفاظ بیک وقت استعمال ہوئے ہیں اور ایک ہی معنی میں استعمال ہوئے ہیں یعنی محمد ﷺ کی روشن شخصیت کے لیے۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ منیر کا لفظ اس آیت میں ''منعکس روشنی'' کے لیے استعمال نہیں ہوا، بلکہ کسی بھی آیت میں یہ لفظ ان معنوں میں استعمال نہیں ہوا۔ اس کا مطلب صرف ''روشن'' ہے۔ محمد ﷺ کے زمانے کے لوگ سمجھتے تھے کہ چاند روشن ہے اور درست سمجھتے تھے، اسی طرح جس طرح موسیٰ علیہ السلام کے زمانے کے لوگ سورج کو بڑی روشنی اور چاند کو چھوٹی روشنی سمجھتے تھے اور وہ بھی ٹھیک سمجھتے تھے۔

لیکن اگر آپ اپنی بات پر اصرار کریں گے کہ عربی لفظ ''نور'' کا مطلب ''منعکس روشنی'' ہی ہوتا ہے تو پھر قرآن میں ان الفاظ کے استعمال سے یہ نتیجہ برآمد ہوگا کہ محمد ﷺ سورج کی طرح اور اللہ چاند کے مانند ہے۔ کیا ڈاکٹر ذاکر نائیک واقعی یہ کہنا چاہتے ہیں کہ محمد ﷺ روشنی کا اصل ذریعہ ہیں اور اللہ اس روشنی کا عکس ہے؟

اس قسم کے نام نہاد ''سائنسی دعوے'' کیے ہی کیوں جاتے ہیں جن کا دفاع کوئی مسلمان خود قرآن کی روشنی میں بھی نہیں کر سکتا۔ اس طرح ہوتا یہ ہے کہ اس قسم کے مکالمے میں ایمان دارانہ بحث مباحثے کے امکانات بہت کم رہ جاتے ہیں بلکہ تقریباً ناممکن ہو جاتے ہیں۔

اب ہم آگے چلتے ہیں اور آبی چکر ''Water Cycle'' کا جائزہ لیتے ہیں۔ بعض مسلمانوں کا کہنا ہے کہ قرآن ہمیں جدید سائنس سے پہلے ہی آبی چکر کے بارے میں معلومات فراہم کر چکا تھا۔

آبی چکر ہوتا کیا ہے؟

آبی چکر کے چار مراحل ہوتے ہیں۔

پہلے مرحلے میں سمندروں اور زمین پر موجود پانی سے بخارات اٹھتے ہیں۔ دوسرے

مرحلے میں یہ بخارات بادلوں میں تبدیل ہوتے ہیں۔ تیسرے مرحلے میں بادلوں سے بارش ہوتی ہے اور چوتھے مرحلے میں اس بارش کی وجہ سے نباتات اگتی ہیں۔ یہ سب کچھ بڑا سیدھا سادا معلوم ہوتا ہے اور دوسرے، تیسرے اور چوتھے مرحلے کے بارے میں تو ہر کوئی جانتا ہے۔ شہروں میں رہنے والے لوگ بھی بہ خوبی جانتے ہیں کہ بادل آتے ہیں پھر بارش ہوتی ہے اور پھر پودے بڑھتے ہیں۔ البتہ بات پہلے مرحلے کی ہے یعنی بخارات اٹھنے کی، کیوں کہ یہ عمل ہمیں نظر نہیں آتا، یہی مرحلہ مشکل ہے اور اسی مرحلے کا ذکر قرآن میں موجود نہیں۔ اب ہم بائبل کی طرف دیکھتے ہیں، بائبل میں ایک پیغمبر جس کا تعلق ۸۰۰ ق م سے ہے، کہتا ہے:

''وہی ثریا اور جبار ستاروں کا خالق ہے جو موت کے سایہ کو مطلعِ نور اور روزِ روشن کو شبِ دیجور بنا دیتا ہے اور سمندر کے پانی کو بلاتا اور روئے زمین پر پھیلاتا ہے۔ جس کا نام خداوند ہے۔'' [عاموس ۸:۵]

یہاں پہلے اور تیسرے مرحلے کا ذکر موجود ہے۔

ایک اور نبی ایوب علیہ السلام ہیں جن کا زمانہ سنہ ہجری کے آغاز سے کم از کم ایک ہزار سال قبل کا ہے، وہ کہتے ہیں:

''دیکھ خدا بزرگ ہے اور ہم اسے نہیں جانتے۔
اس کے برسوں کا شمار دریافت سے باہر ہے۔
کیوں کہ وہ پانی کے قطروں کو اوپر کھینچتا ہے۔
جو اسی کے ابخرات سے بارش کی صورت میں ٹپکتے ہیں۔
جن کو افلاک انڈیلتے اور انسان پر کثرت سے برساتے ہیں۔''

[ایوب ۲۸-۳۶:۲۶]

سو یہاں، بائبل میں ہم دیکھتے ہیں کہ پہلے یعنی سب سے مشکل مرحلے کا بیان قرآن سے ہزار سال پہلے سے موجود ہے۔ اب ہم آگے بڑھتے ہیں اور پہاڑوں کے ذکر کا جائزہ

لیتے ہیں۔ قرآن میں کوئی درجن بھر آیات ایسی ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ اللہ نے پہاڑوں کو زمین پر مضبوطی سے قایم کیا ہے۔ اور ان میں چند آیات میں پہاڑوں کو ایمان والوں کے لیے رحمت اور کافروں کے لیے یاددہانی قرار دیا گیا ہے۔

اس کی ایک مثال سورۂ لقمان میں موجود ہے:

﴿ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا وَاَلْقٰى فِى الْاَرْضِ رَوَاسِىَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ ٥ هٰذَا خَلْقُ اللّٰهِ فَاَرُوْنِىْ مَاذَا خَلَقَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ بَلِ الظّٰلِمُوْنَ فِىْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ٥ ﴾ [لقمٰن: ۱۱-۱۰]

''اس نے آسمانوں کو پیدا کیا بغیر ستونوں کے جو تم کو نظر آئیں، اس نے زمین میں پہاڑ جما دیے تاکہ وہ تم کو لے کر ڈھلک نہ جائے۔ اس نے ہر طرح کے جانور زمین میں پھیلا دیے اور آسمان سے پانی برسایا اور زمین میں قسم قسم کی عمدہ چیزیں اُگا دیں۔ یہ تو ہے اللہ کی تخلیق، اب ذرا مجھے دکھاؤ ان دوسروں نے کیا پیدا کیا ہے؟ اصل بات یہ ہے کہ یہ ظالم لوگ صریح گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔''

اس آیت میں پہاڑ چھ یاددہانیوں میں سے ایک ہے۔ اسی طرح سورۂ انبیاء میں کہا گیا ہے:

﴿ وَجَعَلْنَا فِى الْاَرْضِ رَوَاسِىَ اَنْ تَمِيْدَ بِهِمْ وَجَعَلْنَا فِيْهَا فِجَاجًا سُبُلًا لَّعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ٥ ﴾ [الانبیاء: ۳۱]

''اور ہم نے زمین میں پہاڑ جما دیے تاکہ وہ انھیں لے کر ڈھلک نہ جائے اور اس میں کشادہ راہیں بنا دیں، شاید کہ لوگ اپنا راستہ معلوم کر لیں۔''

سورۂ نحل میں کہا گیا:

﴿ وَاَلْقٰى فِى الْاَرْضِ رَوَاسِىَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ وَاَنْهٰرًا وَّسُبُلًا لَّعَلَّكُمْ

تَهْتَدُوْنَ ۝ ﴾ [النحل: ۱۵]

''اس نے زمین میں پہاڑوں کی میخیں گاڑ دیں تا کہ زمین تم کو لے کر ڈھلک نہ جائے، اس نے دریا جاری کیے اور قدرتی راستے بنائے تا کہ تم ہدایت پاؤ۔''

اگلی دو آیات میں ایک اور تصویر ہمارے سامنے آتی ہے۔

سورۃ النباء میں کہا گیا:

﴿ اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا ۝ وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا ۝ ﴾ [النباء: ۷-۶]

''کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم نے زمین کو فرش بنایا اور پہاڑوں کو میخوں کی طرح گاڑ دیا۔''

﴿ اَوْتَادًا ﴾ وہ میخیں ہوتی ہیں جو خیمہ گاڑنے کے کام آتی ہیں۔ اسی طرح سورۂ غاشیہ میں کہا جاتا ہے:

﴿ اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ۝ وَاِلَى السَّمَآءِ كَيْفَ رُفِعَتْ ۝ وَاِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ ۝ ﴾ [الغاشیہ: ۱۹-۱۷]

''(یہ لوگ نہیں مانتے) تو کیا یہ اونٹوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بنائے گئے؟ آسمان کو نہیں دیکھتے کہ کیسے اٹھایا گیا؟ پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے جمائے گئے؟ اور زمین کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بچھائی گئی؟''

ایک تیسری تصویر لفظ ''رواسی'' کے استعمال سے سامنے آتی ہے، یہ لفظ اسی مادے سے نکلا ہے جس سے وہ لفظ نکلا ہے جو عربی میں ''لنگر'' کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ گویا یہاں بھی وہی تصور موجود ہے، زمین کو کانپنے سے بچانے کا۔ ان سب تصورات سے یہ بات واضح ہے کہ محمد ﷺ کے ماننے والے یہی یقین رکھتے تھے کہ پہاڑ دراصل زمین میں لنگر یا میخوں کی طرح پھینکے گئے ہیں تا کہ یہ زمین کو قایم رکھیں جس طرح لنگر جہاز کو روکے رکھتا ہے یا میخیں خیمے کو روکے رکھتی ہے۔ تا کہ زمین حرکت نہ کرے یا بالفاظ دیگر زلزلے نہ آئیں۔

لیکن درحقیقت یہ بات غلط ہے، کیوں کہ پہاڑوں کی تشکیل تو زلزلوں کا سبب بنتی

ہے۔ لہٰذا یہ آیات یقیناً ایک مسئلہ پیش کرتی ہیں۔ ڈاکٹر موریس بوکائیے کو بھی اس بات کا اندازہ تھا اور انھوں نے اپنی کتاب ''بائبل، قرآن اور سائنس'' میں اس حوالے سے بحث بھی کی ہے۔ پہاڑوں کے بارے میں مذکورہ بالا آیات درج کرنے کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ جدید ماہرین ارضیات کہتے ہیں کہ یہ سطح ارضی کے نقائص پہاڑوں کو بنیادیں فراہم کرتے ہیں۔ اور سطح ارضی کی مضبوطی کا سبب یہی نقائص ہوتے ہیں۔

جب اس بارے میں ارضیات کے پروفیسر Dr. David A. Young سے پوچھا گیا تو انھوں نے جواب دیا:

''اگرچہ یہ بات درست ہے کہ بہت سے پہاڑی سلسلے چٹانوں کی تہوں پر مشتمل ہوتے ہیں اور یہ تہیں بہت عظیم الشان ہوتی ہیں لیکن یہ بات درست نہیں کہ ان تہوں کی وجہ سے سطح ارضی مستحکم ہوتی ہے۔ بلکہ ان تہوں کی موجودگی بذاتِ خود چٹانوں کے عدم استحکام کی نشانی ہوتی ہے۔''

گویا بہ الفاظِ دیگر پہاڑ زمین کے استحکام کا باعث نہیں ہوتے بلکہ اس کے برعکس پہاڑوں کی تشکیل زمین کے کانپنے کا سبب بنتی رہی ہے اور آج بھی بنتی ہے۔ دور جدید کے ارضیاتی نظریات کی روشنی میں دیکھا جائے تو سطح ارضی کا تجزیہ اس طرح کیا گیا ہے کہ ٹھوس ارضی سطح دراصل مختلف تہوں اور حصوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ یہ تہیں ایک دوسرے کے لحاظ سے حرکت بھی کرتی ہیں۔ بعض اوقات تو یہ تہیں علیحدہ بھی ہو جاتی ہیں۔ جس کی مثال شمالی اور جنوبی امریکہ کی یورپ اور جنوبی افریقہ سے علیحدگی ہے۔ اسی طرح بعض اوقات اس کے برعکس یہ ہوتا ہے کہ یہ تہیں ایک دوسرے کے قریب ہو جاتی ہیں اور ایک دوسرے سے ٹکراتی ہیں، جس کے نتیجے میں زلزلے آتے ہیں۔ اس کی ایک مثال مشرقِ وسطیٰ میں ملتی ہے جہاں عرب علاقے کی ایران کی جانب حرکت کے نتیجے میں ایک پہاڑی سلسلے نے تشکیل پائی۔

اسی طرح دنیا بھر میں سڑک پر سفر کرتے ہوئے ایسے مشاہدات ہوتے ہیں کہ کچھ ریتلی پہاڑیاں، جن کی شکل پہلے مختلف تھی اب بدل چکی ہے۔ ان کی حالت تبدیل ہونے کا

سبب بھی زلزلے ہوتے ہیں۔ بعض اوقات یہ تہیں ایک دوسرے سے رگڑ کھانا شروع کر دیتی ہیں۔ اس دوران بہت بڑے پیمانے پر قوت پیدا ہوتی ہے، اس قوت کے نتیجے میں ایک بہت بڑی لہر پیدا ہوتی ہے اور پھر فوراً ہر چیز ساکن ہو جاتی ہے۔

میکسیکو میں آنے والے ایک حالیہ زلزلے کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ جب زلزلہ آیا تو ایک تہہ پورے تین میٹر تک اچھلی تھی۔ آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ اگر آپ کا گھر اچانک تین میٹر اچھلے تو کیا قیامت برپا ہو گی؟ ایک دوسری طرح کے پہاڑ وہ ہوتے ہیں جو آتش فشاں کے ذریعے بنتے ہیں۔ زمین کے اندر سے لاوا اور راکھ قوت کے ساتھ یوں برآمد ہوتے ہیں کہ ان سے ایک پہاڑ بن جاتا ہے۔ ایسا پہاڑ سمندر کی تہہ سے بھی برآمد ہو سکتا ہے۔

بعض اوقات یوں ہوتا ہے کہ لاوے کے دباؤ سے ایک سطح ابھرتی ہے مگر پھٹتی نہیں ایسی جگہ پر جب دباؤ بڑھتا ہے تو یہ پھٹ جاتی ہے جسے آتش فشاں کا پھٹنا کہتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایسا ایک واقعہ جنوبی بحرالکاہل میں کریکاٹو کے مقام پر ۱۸۸۳ء میں ہوا تھا۔ اس واقعہ میں ایک پورا جزیرہ ہی پھٹ گیا تھا۔ اسی طرح ماؤنٹ سینٹ ہیلینا کے واقعے میں بھی ایک پورا پہاڑ ہی پھٹ گیا تھا۔

مندرجہ بالا معلومات کی روشنی میں ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ پہاڑوں کی تشکیل پہلے بھی سطح زمین کی حرکت اور زلزلوں کے باعث ہوئی تھی اور آج بھی اسی طرح ہوتی ہے۔ جس کا نتیجہ زلزلوں کی صورت میں سامنے آتا ہے سطح ارضی کی تہیں جب ایک دوسرے سے رگڑ کھاتی ہیں تو زلزلے آتے ہیں۔ اسی طرح آتش فشاں بھی زلزلے کا سبب بنتے ہیں۔

لیکن یہ بات بھی واضح ہے کہ محمد ﷺ کے پیروکاروں کے لیے ان آیات کا مطلب یہ تھا کہ اللہ نے پہاڑوں کو زمین میں گاڑا ہے، میخوں کی مانند یا لنگر کی طرح، تاکہ زمین حرکت نہ کرے اور مستحکم رہے۔ پہاڑوں کو زمین میں گاڑے جانے کی بات تو شاید شاعرانہ ہے۔ لیکن یہ کہنا کہ پہاڑ زمین کو کانپنے سے بچاتے ہیں، یہ ایک پیچیدہ مسئلہ ہے کیوں کہ یہ

بات جدید سائنس کی رُو سے غلط ہے۔

اب ہم مختصراً اس بات کا جائزہ لیں گے کہ قرآن سورج کے بارے میں ہمیں کیا بتاتا ہے؟

سورۂ کہف میں کہا گیا ہے:

﴿ حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِيْ عَيْنٍ حَمِئَةٍ وَّ وَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا قُلْنَا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِمَّآ اَنْ تُعَذِّبَ وَ اِمَّآ اَنْ تَتَّخِذَ فِيْهِمْ حُسْنًا ۝ ﴾ [الکهف: ٨٦]

''حتیٰ کہ جب وہ غروبِ آفتاب کی حد تک پہنچ گیا، تو اس نے سورج کو ایک کالے پانی میں ڈوبتے دیکھا اور وہاں اسے ایک قوم ملی۔ ہم نے کہا: اے ذوالقرنین! تجھے یہ مقدرت بھی حاصل ہے کہ ان کو تکلیف پہنچائے اور یہ بھی کہ ان کے ساتھ نیک رویہ اختیار کرے۔''

پھر سورۂ فرقان میں یہ بھی کہا گیا:

﴿ اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ وَلَوْ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيْلًا ۝ ثُمَّ قَبَضْنٰهُ اِلَيْنَا قَبْضًا يَّسِيْرًا ۝ ﴾

[الفرقان: ٤٦_٤٥]

''تم نے دیکھا نہیں کہ تمھارا رب کس طرح سایہ پھیلا دیتا ہے؟ اگر وہ چاہتا تو اسے دائمی سایہ بنا دیتا۔ ہم نے سورج کو اس پر دلیل بنایا، پھر (جیسے جیسے سورج اٹھتا جاتا ہے) ہم اس سائے کو رفتہ رفتہ اپنی طرف سمیٹتے جاتے ہیں۔''

اگر ہم اس طرح سوچیں کہ جب سورج ہمارے سر پر ہوتا ہے تو سایہ نہیں ہوتا یا نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے لیکن جوں جوں سورج آگے بڑھتا ہے اس کے مخالف سمت میں سایہ طویل تر ہوتا چلا جاتا ہے۔

لیکن بات یہ ہے کہ سورج تو زمین کے لحاظ سے ساکن ہے۔ زمین کی گردش درحقیقت سائے کے گھٹنے یا بڑھنے کا سبب بنتی ہے۔ گویا زمین کی حرکت سائے کو گھٹانے بڑھانے کا

سبب بنتی ہے۔

اب میں ایک مختلف موضوع کی طرف آتا ہوں۔ قرآن میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات کا واقعہ بیان ہوا ہے اور کہا گیا ہے کہ ان کی وفات کا جنوں کو پتہ اس وقت چلا جب ان کے عصا کو گھن لگ گیا۔ اور وہ گر پڑے۔

گویا صورتِ حال یہ ہے کہ سلیمان علیہ السلام فوت ہو چکے ہیں لیکن ان کا جسم عصا کے سہارے کھڑا ہے۔ کوئی باورچی ان کے پاس نہیں آتا کہ پوچھے؛ حضرت آج کیا کھائیں گے۔ کوئی جنرل احکامات لینے نہیں آتا۔ کوئی درباری آ کر یہ نہیں کہتا کہ شکار پر چلیں۔ میرے لیے یہ کہانی ناقابل یقین ہے کیوں کہ بادشاہ کو کبھی بھی اس طرح اکیلا نہیں چھوڑا جاتا تھا۔

اب ہم ذرا ''دودھ'' کا جائزہ لیتے ہیں۔ سورۂ نحل میں کہا گیا ہے:

﴿ وَإِنَّ لَكُمْ فِي الْأَنْعَامِ لَعِبْرَةً نُّسْقِيكُم مِّمَّا فِي بُطُونِهِ مِن بَيْنِ فَرْثٍ وَدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَائِغًا لِّلشَّارِبِينَ ۝ ﴾ [النحل: ٦٦]

''اور تمھارے لیے مویشیوں میں بھی ایک سبق موجود ہے۔ ان کے پیٹ سے گوبر اور خون کے درمیان ہم تمھیں ایک چیز پلاتے ہیں، یعنی خالص دودھ جو پینے والوں کے لیے نہایت خوشگوار ہے۔''

پیٹ میں سے؟ جہاں آنتیں ہوتی ہیں؟ معاف کیجیے گا۔ بیسویں صدی کے علم طب کے مطابق Mammary Glands جن میں دودھ بنتا ہے، ان کا آنتوں سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اب ہم آتے ہیں ایک اور موضوع کی جانب۔ سورۂ انعام میں کہا گیا ہے:

﴿ وَمَا مِن دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا طَائِرٍ يَطِيرُ بِجَنَاحَيْهِ إِلَّا أُمَمٌ أَمْثَالُكُم مَّا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِن شَيْءٍ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّهِمْ يُحْشَرُونَ ۝ ﴾

[الانعام: ۳۸]

'' زمین میں چلنے والے کسی جانور اور ہوا میں پروں سے اڑنے والے کسی

پرندے کو دیکھ لو، یہ سب تمھاری ہی طرح کی انواع ہیں، ہم نے ان کی تقدیر کے نوشتے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ پھر یہ سب اپنے رب کی طرف سمیٹے جاتے ہیں۔''

اس آیت میں یہ کہا جا رہا ہے کہ ہر جانور اور ہر پرندے کا تعلق ہم انسانوں جیسی انواع سے ہے۔ بعض مکڑیوں میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ نر مکڑی کو مادہ مکڑی کھا جاتی ہے۔ اور مجھے خوشی ہے کہ میری بیوی مجھے نہیں کھائے گی۔ اسی طرح شہد کی مکھیوں میں بھی ضرورت سے زائد نر مکھیوں کو چھتے سے نکال دیا جاتا ہے۔ شکر ہے کہ میری بیوی نے مجھے گھر سے باہر نہیں نکال دیا۔ اسی طرح شیروں میں جب ایک نر شیر بوڑھا ہو جاتا ہے تو جوان شیر اسے بھگا دیتے ہیں۔ اور اس کے بچوں کو مار دیتے ہیں۔

لہٰذا میں یہ نہیں سمجھتا کہ دیگر تمام جانور بھی نوعِ انسانی کی طرح رہتے ہیں۔

نتیجتاً میں کہوں گا کہ یہ واضح ہے کہ قرآن میں بہت سی سائنسی غلطیاں موجود ہیں۔[1] عمومی طور پر قرآن اپنے دور کی علمی سطح کے مطابق ہے اور اس کے تقاضے پورے کرتا ہے۔ یعنی ساتویں صدی عیسوی کی علمی سطح۔

ہم آج یہاں حق کی تلاش میں جمع ہوئے ہیں۔ میں نے اپنی استطاعت کی حد تک مصدقہ معلومات پیش کی ہیں۔ اگر آپ مکمل حوالے دیکھنا چاہیں تو وہ میری کتاب؛

"The Quran and the Bible, in the light of History & Science."

میں موجود ہیں۔

سچائی کا خدا آپ کی رہنمائی کرے۔

شکریہ

☆............☆............☆

---

(۱) نقلِ کفر، کفر نہ باشد۔

خطاب

ڈاکٹر ذاکر نائیک

محترم ڈاکٹر ولیم کیمپبل صاحب، ڈاکٹر مارکوس، ڈاکٹر جمال، سیموئیل نعمان، ڈاکٹر محمد نائیک اور میرے عزیز بھائیو اور بہنو، میں آپ سب کو اسلامی طریقہ سے خوش آمدید کہتا ہوں۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

میں دعا کرتا ہوں کہ آپ سب پر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی رحمتیں اور برکتیں نازل ہوں۔
ہماری آج کی گفتگو کا موضوع ہے:

''قرآن اور بائبل جدید سائنس کی روشنی میں''

قرآنِ مجید وحی کی آخری اور مکمل صورت ہے جو اللہ تعالیٰ کے آخری پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی۔ ہر وہ کتاب جس کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جائے کہ وہ منزل من اللہ ہے اسے وقت کی آزمائش پر پورا اترنا چاہیے۔

دور گزشتہ کو دیکھا جائے تو وہ زمانہ معجزات کا زمانہ تھا۔ الحمدللہ قرآنِ پاک معجزوں کا معجزہ ہے۔ اس کے بعد وہ دور آیا جسے ادب اور شاعری کا دور کہنا چاہیے اور کیا مسلم کیا غیر مسلم، سب اس بات پر متفق ہیں کہ قرآن روئے زمین پر عربی ادب کا بہترین نمونہ ہے۔
لیکن آج کا دور سائنس اور ٹیکنالوجی کا دور ہے۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ قرآن جدید سائنس سے مطابقت رکھتا ہے یا نہیں؟

البرٹ آئن سٹائن نے کہا تھا:

''مذہب سائنس کے بغیر لنگڑا ہے اور سائنس مذہب کے بغیر اندھی ہے۔''

سب سے پہلے تو میں آپ کو یاد کرانا چاہوں گا کہ قرآنِ مبین سائنس کی کتاب نہیں ہے۔ گویا یہ سائنس (Science) کی کتاب نہیں ہے بلکہ نشانیوں (Signs) کی کتاب ہے۔ اس کتاب میں چھ ہزار سے زیادہ نشانیاں یعنی آیات ہیں جن میں تقریباً ایک ہزار ایسی ہیں جن کا تعلق سائنس سے ہے۔

سائنس اور قرآن کے حوالے سے جہاں تک میری گفتگو کا تعلق ہے تو میں اسے صرف ایسے سائنسی حقائق تک محدود رکھوں گا جو ثابت شدہ ہوں۔ میں ان سائنسی نظریات کے بارے میں بات نہیں کروں گا جن کی حیثیت محض مفروضوں اور اندازوں سے زیادہ نہیں، جن کا کوئی ثبوت موجود نہیں، کیوں کہ ہم سب جانتے ہیں کہ سائنس بعض اوقات پلٹا بھی کھا جاتی ہے۔

ڈاکٹر ولیم کیمپبل نے ڈاکٹر موریس بوکائیے کی کتاب ''بائبل، قرآن اور سائنس'' کے جواب میں ''بائبل اور قرآن، تاریخ اور سائنس کی روشنی میں'' لکھی ہے۔ وہ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ دو طریقہ ہائے کار موجود ہیں۔ ایک تطبیق کا طریقہ کار ہے جس کے تحت ایک شخص سائنسی نظریات اور مذہبی بیانات میں مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

دوسرا طریقہ کار اختلاف کا ہے یعنی سائنس اور مذہب کے مابین اختلاف کو سامنے لایا جائے۔ (اور ایک کی روشنی میں دوسرے کو غلط قرار دیا جائے۔)

جیسا کہ محترم ڈاکٹر کیمپبل نے بڑی خوبی سے کیا ہے۔

لیکن جہاں تک قرآن کا تعلق ہے، اس سے قطع نظر کہ کوئی شخص تطبیق کا طریقہ اختیار کرتا ہے یا تردید کا، اگر آپ منطقی دلائل کی روشنی میں اور منطقی طریقہ کار کے تحت آگے بڑھتے ہیں تو کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں ہوگا جو قرآن کے کسی ایک بیان کو بھی جدید سائنس کی روشنی میں غلط ثابت کر سکے۔

ڈاکٹر ولیم کیمپبل نے جدید سائنس کی روشنی میں قرآن میں متعدد نام نہاد غلطیوں کی

نشان دہی کی ہے، جن کا جواب مجھے تقریب کے دوسرے حصے میں یعنی ...... جوابی خطاب میں دینا ہے۔ لیکن چوں کہ انھوں نے پہلے گفتگو کرنے کا فیصلہ کیا تھا لہٰذا ان کے چند نکات کا جواب میں اسی گفتگو کے دوران دوں گا۔ ان کی گفتگو کا بیش تر حصہ علم الجنین اور ارضیات سے متعلق تھا، لہٰذا اس حوالے سے ان کے اعتراضات کا جواب میں ابھی دے دوں گا جب کہ باقی ماندہ اعتراضات کا جواب دینے کی کوشش میں ان شاء اللہ اپنی جوابی گفتگو میں کروں گا۔

بات یہ ہے کہ ہمارا موضوع ''قرآن اور بائبل، سائنس کی روشنی میں'' ہے۔ لہٰذا یہ مناسب نہیں ہے کہ میں ایک ہی کتاب مقدسہ کے بارے میں بات کروں۔ یہ موضوع سے انصاف نہیں ہوگا۔ میں قرآن اور بائبل دونوں کے بارے میں بات کرنے کی کوشش کروں گا۔ ڈاکٹر ولیم کیمپبل نے بائبل کے بارے میں مشکل سے ایک دو باتیں ہی کی ہیں۔ انشاء اللہ میں اس بارے میں مفصل بات کروں گا۔ کیوں کہ میں موضوع سے انصاف کرنا چاہتا ہوں، جہاں تک قرآن اور جدید سائنس کا تعلق ہے، ہم بات کا آغاز فلکیات سے کریں گے۔ چند دہائیاں پیش تر سائنسدانوں اور ماہرین فلکیات نے ہمیں بتایا کہ کائنات کس طرح وجود میں آئی۔ وہ اس نظریے کو ''عظیم دھماکہ'' یا Big Bang کہتے ہیں۔ اس کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں کہ ایک Primary Nebula بہت بڑے دھماکے کے ساتھ پھٹا اور اس کے نتیجے میں کہکشائیں اور اجرام فلکی وجود میں آئے۔ یعنی ستارے، سورج، چاند اور وہ زمین بھی جس پر آج ہم رہ رہے ہیں۔ یہ ساری معلومات قرآن میں نہایت اختصار کے ساتھ بیان کردی گئی ہیں۔

سورۂ انبیاء میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ اَوَلَمْ یَرَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ کَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰھُمَا وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ کُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ اَفَلَا یُؤْمِنُوْنَ ۝ ﴾ [الانبیاء: ۳۰]

''کیا وہ لوگ جنھوں نے (نبی ﷺ کی بات ماننے سے) انکار کردیا ہے،

غور نہیں کرتے کہ یہ سب آسمان اور زمین باہم ملے ہوئے تھے، پھر ہم نے انھیں جدا کیا اور پانی سے ہر زندہ چیز پیدا کی؟ کیا وہ (ہماری اس خلاقی کو) نہیں مانتے؟''

ذرا تصور کیجیے، یہ بات حال ہی میں ہمارے علم میں آئی ہے لیکن قرآن میں یہ بات آج سے چودہ سو سال پہلے ہی بیان کی جا چکی تھی۔ جب میں سکول میں تھا تو ہمیں بتایا جاتا تھا کہ سورج ساکن ہے جب کہ زمین اور چاند اپنے مداروں میں سورج کے گرد گردش کر رہے ہیں۔ یعنی چاند اور زمین تو اپنے مداروں میں متحرک ہیں مگر سورج ایک مقام پر ساکن ہے۔ لیکن قرآنِ مجید کی ایک آیت میں فرمایا گیا ہے:

﴿ وَهُوَ الَّذِىْ خَلَقَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ فِىْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ۝ ﴾ [الانبیاء: ۳۳]

''اور وہ اللہ ہی ہے جس نے رات اور دن بنائے اور سورج اور چاند کو پیدا کیا۔ سب ایک ایک فلک میں تیر رہے ہیں۔''

یعنی ہر کوئی اپنے اپنے فلک میں، اپنے اپنے مدار میں حرکت کر رہا ہے۔ الحمدللہ آج جدید سائنس بھی اس آیت قرآنی کی تصدیق کر چکی ہے۔ قرآن میں اس مقام پر جو عربی لفظ استعمال ہوا ہے وہ ہے ﴿ يَسْبَحُوْنَ ﴾۔ یہ لفظ ایک ایسے جسم کی حرکت ظاہر کرتا ہے جو اپنے مقام پر بھی متحرک ہو۔ گویا جہاں اجرامِ فلکی کا ذکر ہو وہاں یہ لفظ اپنے مرکز کے گرد حرکت کو بھی ظاہر کرتا ہے۔

پس قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ چاند اور سورج اپنے مرکز کے گرد بھی گھومتے ہیں اور اپنے اپنے مداروں میں بھی تیر رہے ہیں۔ آج جدید سائنس ہمیں بتاتی ہے کہ سورج تقریباً ۲۵ دن میں اپنے مرکز کے گرد ایک چکر پورا کر لیتا ہے۔

ایڈون ہبل وہ سائنس دان تھا جس نے پہلی بار یہ حقیقت دریافت کی کہ ہماری کائنات مسلسل پھیل رہی ہے۔ لیکن قرآنِ مجید کی سورۂ ذاریات میں فرمایا گیا ہے:

﴿ وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْىدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ ○ ﴾ [الذّٰریٰت : ٤٧]

''آسمان کو ہم نے اپنے زور سے بنایا ہے اور ہم اسے وسیع کرنے والے ہیں۔''

یہاں کائنات کے پھیلنے کا ذکر ہے، عربی کے لفظ ﴿ مُوْسِعُوْنَ ﴾ کا مطلب ہے وسعت دینے والا، وسیع کرنے والا۔

فلکیات کے حوالے سے جن باتوں کا ذکر ڈاکٹر ولیم کیمپبل نے کیا ہے ان کا جواب میں اپنی جوابی گفتگو کے دوران میں ہی دوں گا۔ ان شاء اللہ۔

جہاں تک ''آبی چکر'' کا تعلق ہے ڈاکٹر ولیم کیمپبل نے اپنی گفتگو میں چار مراحل کا حوالہ دیا ہے۔ جب کہ اپنی کتاب میں وہ چوتھے مرحلے کا (a) اور (b) دو حصوں میں ذکر کرتے ہیں۔ آخری مرحلے کا ذکر انھوں نے اپنی گفتگو میں نہیں کیا۔ پتہ نہیں کیوں......

یہ مرحلہ Driplination کہلاتا ہے، شاید انھوں نے اس لیے اس کو نظر انداز کر دیا ہوگا کہ اس کا ذکر بائبل میں موجود نہیں ہے۔

وہ کہتے ہیں قرآن کی کسی آیت میں بھی بخارات بننے کے عمل کا ذکر نہیں ہے۔ قرآن آبی چکر کے بارے میں ہمیں بڑی وضاحت سے بتاتا ہے۔ سورۂ الطارق میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ ○ ﴾ [الطارق : ١١]

''اور قسم ہے پلٹانے والے آسمان کی۔''

تقریباً تمام مفسرین کہتے ہیں کہ یہاں اس آیت میں جو رجوع یا پلٹانے کی بات کی گئی ہے اس سے مراد بارش کو پلٹانے یا بخارات کی صورت میں پانی کے بادلوں میں تبدیل ہونے کی حقیقت ہے۔

ڈاکٹر ولیم کیمپبل جو عربی جانتے ہیں، اس موقع پر یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے یہ بات واضح الفاظ میں بیان کیوں نہیں کی؟ صاف صاف الفاظ میں یہ کیوں نہیں کہا کہ آسمان بخارات کو بارش کی صورت میں پلٹا دیتا ہے؟

لیکن آج ہم جانتے ہیں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے یوں کیوں نہیں فرمایا؟ اسی میں حکمت تھی کیوں کہ آج ہمیں یہ علم ہوا ہے کہ زمین کے اوپر موجود فضائی سطح (Ozonosphere) نہ صرف بخارات اور بادلوں کو بارش کی صورت میں زمین کی طرف پلٹاتی ہے بلکہ زمین سے اوپر جانے والی فایدہ مند حرارت اور قوت کو بھی واپس پلٹاتی ہے جو کہ انسانیت کے لیے فایدہ مند ہیں۔

آج ہمیں یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ یہ سطح ریڈیو، ٹی وی وغیرہ کی نشریاتی لہروں کو پلٹانے کا بھی سبب بنتی ہے۔

مزید برآں یہ سطح یعنی Ozonosphere بیرونی خلا سے آنے والی نقصان دہ شعاعوں کو روکنے اور پلٹانے کا سبب بھی بنتی ہیں۔ مثال کے طور پر سورج سے آنے والی بالا بنفشی شعاعیں، جنھیں اوزون کی سطح جذب کر لیتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو زمین پر حیات ختم ہو سکتی ہے۔

لہٰذا اللہ سبحانہ وتعالیٰ عظیم ہے اور بالکل بجا طور پر ارشاد فرماتا ہے:

﴿ وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ ۝ ﴾ [الطارق: ۱۱]

''اور قسم ہے پلٹانے والے آسمان کی۔''

دیگر باتیں جن کا انھوں نے ذکر کیا ہے، وہ بھی قرآن میں موجود ہیں۔ تفصیل کے لیے آپ میری ویڈیو کیسٹ دیکھ سکتے ہیں۔[1] قرآن تو آبی چکر کا ذکر بڑی وضاحت کے ساتھ کرتا ہے۔

جہاں تک بائبل میں آبی چکر کے ذکر کا تعلق ہے، تو انھوں نے پہلے تو آبی چکر کے پہلے اور تیسرے مرحلے کا حوالہ دیا اور بعد ازاں پہلے، تیسرے اور دوسرے مرحلے کا۔ انھوں نے کہا کہ پانی اوپر جاتا ہے اور بارش کی صورت میں دوبارہ زمین پر آتا ہے۔ یہ ملی ٹس کا فلسفہ ہے جو کہ ساتویں صدی قبل مسیح کا فلسفی تھا۔ اس کا خیال تھا کہ سمندر کی سطح سے بخارات

(۱) ڈاکٹر صاحب کی اس تقریر کا اُردو ترجمہ ''قرآن اور سائنس'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ (ناشر)

کو ہوا اٹھا کر لے جاتی ہے جو بعدازاں بارش کی صورت میں برستے ہیں۔ اس فلسفے میں بادلوں کا کہیں ذکر نہیں ہے۔

دوسرا حوالہ جو ڈاکٹر کیمپبل نے دیا، اس میں پہلی بات یہ کی گئی کہ پانی بخارات میں تبدیل ہوتا ہے، ہم اس بات سے اتفاق کرتے ہیں، ہمیں بائبل کے ساتھ تطبیق کا رویہ اختیار کرنے پر کوئی اعتراض نہیں۔ اس کے بعد بارش کا ذکر ہے اور پھر دوبارہ بادلوں کا۔ یہ سب بجا لیکن یہ مکمل آبی چکر نہیں ہے۔

الحمدللہ قرآن اس آبی چکر کو بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کرتا ہے اور وہ بھی متعدد مقامات پر۔ بادلوں کا بننا، ان کی حرکت، ان کا برسنا اور پھر پانی کی دوبارہ بخارات میں تبدیلی، ان سب مراحل کا ذکر قرآن میں موجود ہے۔

مندرجہ ذیل آیاتِ قرآنی میں ہمیں آبی چکر کا ذکر ملتا ہے۔

سورۂ نور، آیت: ۴۳	سورۂ روم، آیت: ۴۸
سورۂ الزمر، آیت: ۲۱	سورۂ مومنون، آیت: ۱۸
سورۂ روم، آیت: ۲۴	سورۂ حجر، آیت: ۲۲
سورۂ اعراف، آیت: ۵۷	سورۂ رعد، آیت: ۱۷
سورۂ الفرقان، آیات: ۴۸۔۴۹	سورۂ فاطر، آیت: ۹
سورۂ جاثیہ، آیت: ۵	سورۂ ق، آیت: ۹
سورۂ واقعہ، آیات: ۶۸ تا ۷۰	سورۂ الملک، آیت: ۳۰

قرآنِ مجید کی مندرجہ بالا تمام آیاتِ کریمہ میں آبی چکر Water Cycle کا ذکر موجود ہے۔

ڈاکٹر ولیم کیمپبل نے اپنی گفتگو کا بیشتر وقت علم الجنین Embryology کے حوالے سے گفتگو میں صرف کیا ہے۔ میں نے نوٹ کیا تھا۔ ان کی تقریباً نصف گفتگو علم الجنین سے متعلق تھی۔ اس کے بعد انھوں نے ارضیات کے حوالے سے نسبتاً زیادہ گفتگو کی اور پھر چھ

دیگر موضوعات کے حوالے سے سرسری گفتگو کی۔

جہاں تک ارضیات کا تعلق ہے، جدید ماہرین ارضیات ہمیں بتاتے ہیں کہ زمین کا قطر تقریباً تین ہزار سات سو پچاس میل ہے، زمین کی سب سے باہری سطح ٹھنڈی ہے لیکن اندرونی پرتیں انتہائی گرم اور پگھلی ہوئی حالت میں ہیں، جہاں زندگی کا کوئی امکان موجود نہیں۔ اور یہ کہ زمین کی سب سے بیرونی پرت جس پر ہم آباد ہیں، نسبتاً انتہائی باریک ہے، اس کی موٹائی ایک میل سے لے کر ۳۰ میل تک ہے، چند حصے نسبتاً زیادہ موٹے ہوسکتے ہیں لیکن عموماً یہ پرت ایک سے تیس میل کے درمیان ہی ہوتی ہے۔

اس پرت یا سطح کے ''ہلنے'' کے قوی امکانات موجود رہتے ہیں جس کی ایک وجہ ''بل پڑنے کا عمل'' ہے، جس کے نتیجے میں پہاڑ بنتے ہیں اور زمین کی سطح کو استحکام ملتا ہے۔ قرآن کی سورۂ نبا میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا ۝ وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا ۝ ﴾ [النباء: ۷۔۶]

''کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم نے زمین کو فرش بنایا اور پہاڑوں کو میخیں۔''

قرآن یہ نہیں کہتا کہ پہاڑوں کو میخوں کی طرح زمین میں اوپر سے گاڑا گیا ہے بلکہ یہ کہ پہاڑوں کو میخوں کی طرح بنایا گیا ہے۔ اوتاداً کا مطلب خیمے گاڑنے والی میخیں ہی ہوتا ہے۔ آج جدید علم ارضیات بھی اس بات کی تائید کرتا ہے کہ پہاڑوں کی جڑیں زمین میں گہرائی تک ہوتی ہیں۔ یہ بات انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں سامنے آئی تھی کہ پہاڑ کا بیشتر حصہ زمین کے اندر ہوتا ہے اور صرف تھوڑا سا حصہ ہمیں نظر آتا ہے، بالکل اسی طرح جیسے زمین میں گڑی ہوئی میخ کا بیشتر حصہ ہماری نظروں سے اوجھل ہوتا ہے۔ یا جس طرح ''آئس برگ'' کی صرف چوٹی ہمیں نظر آتی ہے جب کہ ۹۰ فی صد حصہ پانی کے اندر ہوتا ہے۔

سورۂ غاشیہ میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ وَاِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ ۝ ﴾ [الغاشیہ: ۱۹]

''اور پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے جمائے گئے؟''

ایک اور جگہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَالْجِبَالَ أَرْسٰهَا ۝ ﴾ [النازعات: ۳۲]

''اور پہاڑ اس میں کھڑے کر دیے۔''

جدید ارضیاتی نظریے اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ پہاڑی سلسلے سطح زمین کو استحکام فراہم کرتے ہیں۔ تمام ماہرین ارضیات نہیں لیکن کئی ماہرین یہی کہتے ہیں۔ میں ڈاکٹر ولیم کیمپبل کو چیلنج کرتا ہوں کہ وہ علم ارضیات کی کسی ایک مستند کتاب میں وہ بات دکھادیں جو انھوں نے کی۔ اور میں مستند کتاب کا ذکر کر رہا ہوں۔ ان کی ''ذاتی خط و کتابت'' کا نہیں۔ دستاویزی ثبوت مانگ رہا ہوں۔

دوسری طرف ایک کتاب ہے جس کا نام ہے ''زمین'' (Earth)۔ یہ کتاب بیش تر یونیورسٹیوں کے ارضیات کے نصاب میں شامل ہے۔ اس کتاب کے مصنفین میں ڈاکٹر فرینک پریس بھی شامل ہیں جو سابق امریکی صدر جمی کارٹر کے مشیر رہ چکے ہیں اور امریکہ کی اکیڈمی آف سائنسز کے بھی صدر رہے ہیں۔ وہ اس کتاب میں کہتے ہیں کہ پہاڑ مثلث نما ہوتے ہیں، زمین کے اندر گہرائی تک ان کی جڑیں ہوتی ہیں اور یہ کہ پہاڑ زمین کو استحکام فراہم کرتے ہیں۔

جب قرآن کہتا ہے:

﴿ وَجَعَلْنَا فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ أَنْ تَمِيْدَ بِهِمْ وَ جَعَلْنَا فِيْهَا فِجَاجًا سُبُلًا لَّعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ۝ ﴾ [الانبیاء: ۳۱]

''اور ہم نے زمین میں پہاڑ جمادیے تاکہ وہ انھیں لے کر ڈھلک نہ جائے اور اس میں کشادہ راہیں بنادیں، شاید کہ لوگ اپنا راستہ معلوم کرلیں۔''

﴿ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا وَأَلْقٰى فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ أَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ ﴾ [لقمٰن: ۱۰]

''اس نے آسمانوں کو پیدا کیا بغیر ستونوں کے جو تم کو نظر آئیں۔ اس نے زمین میں پہاڑ جما دیے، تاکہ وہ تمھیں لے کر ڈھلک نہ جائے۔''

﴿ وَأَلْقَىٰ فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ أَن تَمِيدَ بِكُمْ وَأَنْهَارًا وَسُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ۝ ﴾ [النحل: ۱۵]

''اس نے زمین میں پہاڑوں کی میخیں گاڑ دیں تاکہ زمین تم کو لے کر ڈھلک نہ جائے، اس نے دریا جاری کیے اور قدرتی راستے بنائے، تاکہ تم ہدایت پاؤ۔''

گویا قرآن میں بھی پہاڑوں کا مقصد یہی بتایا گیا ہے کہ وہ سطح زمین کو استحکام فراہم کرتے ہیں۔ قرآن کی ان آیات میں یہ کہیں بھی نہیں کہا گیا کہ پہاڑ زلزلوں کو روکتے ہیں۔ ڈاکٹر ولیم کیمپبل نے اپنی کتاب میں یہ بات لکھی ہے اور اپنی گفتگو میں بھی کہا ہے کہ پہاڑی علاقوں میں زلزلے زیادہ آتے ہیں اور یہ کہ پہاڑ زلزلوں کا باعث بنتے ہیں۔

یہاں قابل توجہ بات یہ ہے کہ قرآن میں یہ تو کہیں نہیں کہا گیا کہ پہاڑ زلزلوں کو روکتے ہیں۔ عربی میں زلزلے کے لیے ''زلزال'' کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ ڈاکٹر کیمپبل چوں کہ عربی جانتے ہیں لہٰذا یہ بات ان کے بھی علم میں ہوگی۔ لیکن ان تینوں آیات میں، جن کا میں نے حوالہ دیا، کہیں بھی زلزلے کا لفظ استعمال نہیں ہوا۔ ان میں جو لفظ استعمال ہوا ہے وہ ہے ''تَمِیدًا'' جس کے معنی ''ڈھلکنے'' یا ''جھولنے'' کے ہوتے ہیں اور قرآن ان تینوں آیات میں یہی لفظ استعمال کرتا ہے کہ زمین تمھیں لے کر ڈھلک نہ جائے، جھول نہ پڑے۔ اگر پہاڑ نہ ہوتے تو زمین حرکت کرتی۔ یہی بات قرآن میں کہی گئی ہے اور یہی بات ڈاکٹر فرینک پریس کر رہے ہیں۔ یہی بات ڈاکٹر نجات لکھتے ہیں۔ ڈاکٹر نجات کا تعلق سعودی عرب سے ہے اور انھوں نے قرآن کے ارضیاتی تصورات پر ایک کتاب لکھی ہے۔ اور یہ کتاب ڈاکٹر ولیم کیمپبل کے جملہ اعتراضات کے تفصیلی جوابات فراہم کر دیتی ہے۔

یعنی ڈاکٹر ولیم کیمپبل کا کہنا یہ تھا کہ اگر پہاڑ زمین کو کانپنے سے روکتے ہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ پہاڑی علاقوں میں زلزلے زیادہ آتے ہیں؟

اور میرا جواب یہ ہے کہ نہیں، قرآن میں کہاں لکھا ہوا ہے کہ پہاڑ زلزلوں کو روکتے ہیں؟ زلزلے کو عربی میں زلزال کہتے ہیں۔ آکسفرڈ ڈکشنری میں زلزلے کی تعریف کچھ یوں کی گئی ہے:

Earthquake is due to convulsion of the superficial crust of the earth, due to relief of compressed siesmic waves, due to a crack in the rock or due to volcanic reaction.

زلزلے یا بھونچال کا ذکر قرآن سورۂ زلزال میں کرتا ہے، لیکن یہاں زلزال کا لفظ استعمال نہیں ہو رہا بلکہ تمید بکم کا لفظ استعمال ہوا ہے یعنی ڈولنے یا ڈھلکنے کا ذکر ہے۔

اسی طرح جہاں تک اس بیان کا تعلق ہے:

''اگر پہاڑ زلزلوں کو روکتے ہیں تو پھر پہاڑی علاقوں میں ہی زیادہ زلزلے کیوں آتے ہیں؟''

تو اس بات کا جواب دینے کے لیے میں ایک مثال پیش کرنا چاہوں گا۔ فرض کیجیے میں کہتا ہوں کہ ڈاکٹر حضرات انسانوں کو لاحق ہونے والی بیماریوں اور امراض کا علاج کرتے ہیں۔ اب اگر کوئی شخص مجھ پر اعتراض کرتے ہوئے کہے کہ اگر ڈاکٹر بیماریوں کو ٹھیک کرتے ہیں تو پھر زیادہ مریض ہسپتالوں میں کیوں پائے جاتے ہیں جہاں زیادہ تعداد میں ڈاکٹر موجود ہوتے ہیں، بہ نسبت گھروں کے، جہاں ڈاکٹر نہیں ہوتے؟ تو کیا اس معترض کا استدلال درست ہوگا؟

اب ہم سمندروں کے موضوع کی طرف آتے ہیں۔ قرآن مجید میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَهُوَ الَّذِىْ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ

وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَحِجْرًا مَّحْجُورًا ٥﴾ [الفرقان : ۵۳]

''اور وہی ہے جس نے دو سمندروں کو ملا رکھا ہے، ایک لذیذ و شیریں دوسرا تلخ وشور۔ اور دونوں کے درمیان ایک پردہ حائل ہے۔ ایک رکاوٹ ہے جو انھیں گڈمڈ ہونے سے روکے ہوئے ہے۔''

اسی طرح قرآن مجید کی سورۂ رحمان میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ ٥ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ ٥﴾

[الرحمن: ۱۹،۲۰]

''دو سمندروں کو اس نے چھوڑ دیا کہ باہم مل جائیں پھر بھی ان کے درمیان ایک پردہ حائل ہے جس سے وہ تجاوز نہیں کرتے۔''

قدیم مفسرین قرآن کے اس مقام کی وضاحت کرتے ہوئے بڑے پریشان ہوتے تھے کہ اس آیت کا کیا مفہوم بیان کریں۔ انھیں کڑوے اور میٹھے پانی کا تو علم تھا لیکن یہ کہ ایسی کوئی رکاوٹ ہے یا پردہ ہے جو انھیں آپس میں حل نہیں ہونے دیتا، اس بات کی وضاحت ان کے لیے مشکل تھی۔

لیکن آج علم بحریات ترقی کر چکا ہے، لہٰذا ہم جانتے ہیں کہ جب ایک قسم کا پانی دوسری قسم کے پانی کے ساتھ ملتا ہے تو دونوں کے اجزاء ایک دوسرے میں حل ہوتے ہیں اور یوں ایک طرح کا محلول تیار ہوتا ہے، یہ یکساں محلول، جس میں دونوں طرح کے پانی کی خصوصیات موجود ہوتی ہیں، لیکن یہ دونوں طرح کے پانیوں کو الگ الگ بھی رکھتا ہے۔ قرآن اس کے لیے ''برزخ'' کی اصطلاح استعمال کرتا ہے۔ اس بات پر متعدد بڑے سائنس دانوں کا اتفاق رائے ہے۔ جن میں امریکہ کے ایک سائنس دان Dr. Hay بھی شامل ہیں جو کہ بحری علوم کے ماہر ہیں۔

ڈاکٹر ولیم کیمپبل اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ یہ تو ایک عام سی بات ہے۔ اور اس دور کے ماہی گیر بھی جانتے تھے کہ دو طرح کا پانی ہوتا ہے میٹھا اور کڑوا۔ اور حضرت محمدؐ اپنے سفر

شام کے دوران میں سمندری سفر کے ذریعے یا ان ماہی گیروں کے ساتھ گفتگو کے ذریعے اس صورتِ حال سے آگاہ ہو سکتے تھے۔

اب ہم آتے ہیں علم الجنین والے معاملے کی جانب۔ ڈاکٹر ولیم کیمپبل کی گفتگو کا نصف سے زیادہ حصہ اسی موضوع سے متعلق تھا۔ وقت مجھے اتنی اجازت نہیں دیتا کہ میں ان کی ہر غیر منطقی بات کا جواب دے سکوں۔ لہٰذا میں مختصر جواب دوں گا، مزید تفصیل کے لیے آپ میری کتاب ''قرآن اور جدید سائنس'' اور اس موضوع پر میری تقاریر سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

کچھ عرصہ قبل چند عربوں نے علم الجنین سے متعلق قرآن مجید اور احادیث نبویہ کو اکٹھا کیا اور یہ سارا لوازمہ انھوں نے کینیڈا ڈاکٹر کیتھ مور کو پیش کر دیا جو یونیورسٹی آف ٹورانٹو، کینیڈا میں اس شعبہ کے سربراہ ہیں اور دورِ حاضر میں ان کا شمار علم الجنین کے بڑے ماہرین میں ہوتا ہے۔ ان آیات واحادیث کے تراجم کا مطالعہ کرنے کے بعد جب ان سے تبصرے کے لیے کہا گیا تو انھوں نے کہا کہ ان میں سے بیش تر آیات اور احادیث تو جدید ترین تحقیقات سے مکمل مطابقت رکھتی ہیں۔ البتہ چند باتیں ایسی ہیں جنھیں نہ وہ درست قرار دے سکتے ہیں اور نہ ہی غلط کہہ سکتے ہیں کیوں کہ جدید سائنس نے ابھی تک ان کی مکمل وضاحت ہی نہیں کی۔ یعنی انھوں نے کہا کہ وہ خود ان کے بارے میں مکمل علم نہیں رکھتے۔ اور ان میں دو آیات وہ تھیں جو ترتیب نزولی کے اعتبار سے قرآن کی اوّلین آیات ہیں:

﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ٥ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ٥﴾

[العلق: ۱، ۲]

''پڑھو! (اے نبیؐ!) اپنے رب کے نام کے ساتھ، جس نے پیدا کیا جس نے ''علقہ'' سے انسان کی تخلیق کی۔''

''علق'' سے مراد کوئی چپکنے والی چیز یا جونک نما چیز ہے۔

جہاں تک ڈاکٹر ولیم کیمپبل کے اس بیان کا تعلق ہے کہ ہمیں کسی کتاب کا مطالعہ

کرتے ہوئے الفاظ کے وہی معنی سامنے رکھنے چاہئیں جو اس وقت مراد لیے جاتے تھے جب کتاب تحریر ہوئی تھی۔ یا وہی معنی قبول کرنے چاہئیں جو معنی اوّلین مخاطبین کے نزدیک درست تھے۔

میں ڈاکٹر کیمپبل کی اس بات سے اتفاق کرتا ہوں لیکن صرف بائبل کے معاملے میں۔ بائبل کے حق میں تو ان کی یہ بات بالکل درست ہے کیونکہ بائبل ایک ایسی کتاب ہے جس کے مخاطبین صرف اس دور کے لوگ تھے۔ بلکہ صرف بنی اسرائیل تھے۔ یہ بات بائبل میں اس طرح بیان ہوئی ہے۔ بارہ حواریوں کے نام بیان کرنے کے بعد تحریر ہے:

> ''ان بارہ کو یسوع نے بھیجا اور ان کو حکم دے کر کہا: ''غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا۔ بلکہ اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جانا۔'' [متی۔ باب ۱۰۔ ۶،۷]

یہاں انھیں غیر قوموں کی طرف جانے سے خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام منع کر رہے ہیں۔ غیر قوموں سے کیا مراد ہے؟ غیر قوموں سے مراد ہندو ہیں، مسلمان ہیں، تمام غیر یہودی اقوام ہیں۔ اس طرح متی کی انجیل میں دوبارہ کہا گیا ہے:

> ''میں اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا کسی اور کے پاس نہیں بھیجا گیا۔'' [متی۔ باب ۱۵۔ ۲۴]

گویا بائبل اور حضرت یسوع مسیح علیہ السلام کا پیغام ہدایت صرف بنی اسرائیل کے لیے تھا اور چونکہ یہ پیغام صرف ایک قوم تک محدود تھا لہٰذا یہاں وہ معانی مراد لینا درست ہوگا جو ان لوگوں کے نزدیک تھے۔

لیکن قرآن کا معاملہ مختلف ہے۔ قرآن صرف اس دور کے عربوں کے لیے نازل نہیں ہوا تھا۔ قرآن کا پیغام صرف مسلمانوں کے لیے بھی نہیں ہے۔ یہ تو پوری انسانیت کے لیے پیغام ہدایت ہے۔ اور ہر زمانے کے لیے بھیجا گیا ہے۔

سورۂ ابراہیم میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ ﴾ [ابراهیم : ۵۲]

’’یہ ایک پیغام ہے سب انسانوں کے لیے۔‘‘

اسی طرح سورۂ بقرہ میں کہا گیا:

﴿ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ ﴾ [البقرہ: ۱۸۵]

’’قرآن انسانوں کے لیے سراسر ہدایت ہے۔‘‘

سورۂ زمر میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ اِنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ لِلنَّاسِ بِالْحَقِّ ﴾ [الزمر: ۴۱]

’’(اے نبیؐ!) ہم نے سب انسانوں کے لیے یہ کتاب برحق تم پر نازل کر دی ہے۔‘‘

ان آیات سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن کا پیغام پوری بنی نوع انسانیت کے لیے ہے۔ اور حضرت محمد ﷺ کو صرف عربوں کے لیے ہدایت دے کر نہیں بھیجا گیا تھا۔

اللہ تعالیٰ سورۂ انبیاء میں ارشاد فرماتا ہے:

﴿ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ ﴾ [الانبیاء: ۱۰۷]

’’(اے نبیؐ!) ہم نے تو تم کو دنیا والوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔‘‘

لہٰذا جہاں تک قرآن کا تعلق ہے، آپ قرآنی الفاظ کے معانی کو قطعاً اس دور تک محدود نہیں کر سکتے جس دور میں یہ نازل ہوا تھا۔ کیونکہ اس کتاب کا پیغام کسی زمانے تک محدود نہیں ہے۔

(اب ہم سابقہ گفتگو کی طرف لوٹتے ہیں) علق کا ایک مطلب جونک نما چیز یا چپکنے والی چیز ہوتا ہے۔ ڈاکٹر کیتھ مور کہتے ہیں کہ مجھے علم نہیں تھا کہ جنین کی ابتدائی مرحلے میں جونک سے کوئی مشابہت ہوتی ہے یا نہیں۔‘‘ لہٰذا موصوف اپنی تجربہ گاہ میں گئے اور جنین کے ابتدائی مرحلے کا خوردبین سے جائزہ لینے کے بعد اس کا تقابل جونک کی تصویر سے کیا اور وہ دونوں کے درمیان موجود حیرت انگیز مشابہت کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔

ڈاکٹر ولیم کیمپبل نے آپ کو بالکل مختلف تناظر دکھایا ہے۔ ان کی کتاب میں جو تصویر ہے وہ مختلف رُخ سے ہے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ ایک ہی چیز کو جب مختلف تناظر میں دیکھا جائے تو وہ خاصی مختلف محسوس ہو سکتی ہے۔

ڈاکٹر کیتھ مور سے ۸۰ سوالات کیے گئے۔ ڈاکٹر کیتھ مور نے یہ بھی کہا کہ اگر یہ ۸۰ سوالات ان سے ۳۰ سال قبل کیے جاتے تو شاید وہ پچاس فی صد سوالات کا بھی جواب نہ دے پاتے۔ کیوں کہ گزشتہ تیس سال کے عرصے میں علم الجنین نے بہت زیادہ ترقی کی ہے۔ اور یہ بات ڈاکٹر کیتھ مور نے ۱۹۸۰ء کی دھائی میں کی تھی۔

اب صورت یہ ہے کہ ڈاکٹر کیتھ مور کا یہ بیان تحریری صورت میں بھی دستیاب ہے اور ان کی گفتگو کی ریکارڈنگ بھی موجود ہے۔ آپ ویڈیو کیسٹ میں خود بھی دیکھ سکتے ہیں۔ تو اب یہ بتائیے کہ ان کے اس بیان پر یقین کیا جائے گا یا ڈاکٹر کیمپبل کے ساتھ ان کی نجی گفتگو پر؟

ڈاکٹر کیتھ مور نے یہ تحقیقات ایک کتاب کی صورت میں بھی پیش کی تھیں جس کا عنوان تھا ''The Developing Human''۔ اس کتاب کو اس سال کی ایک مصنف کی لکھی ہوئی بہترین طبی کتاب کا ایوارڈ بھی ملا تھا۔ اس کتاب کا اسلامی ایڈیشن ڈاکٹر عبدالمجید الزندانی نے شایع کیا تھا جس پر ڈاکٹر مور کی تصدیق بھی موجود ہے۔

قرآن مجید کی سورۂ مومنون میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ ۝ ﴾ [المؤمنون: ۱۳]

''پھر اسے ایک محفوظ جگہ ٹپکی ہوئی بوند میں تبدیل کیا۔''

سورۂ حج میں بلکہ قرآن میں گیارہ مقامات پر یہ بات کہی گئی ہے کہ انسان کی تخلیق نطفے سے ہوئی ہے۔ اور نطفہ عربی زبان میں ''مایع کی انتہائی قلیل مقدار'' کو کہتے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ مقدار جو پیالے کی تہہ سے لگی رہ جاتی ہے یعنی قلیل ترین مقدار۔

آج ہم جانتے ہیں کہ مادہ منویہ میں موجود کروڑوں جرثوموں میں سے کوئی ایک بھی

جنین کی تشکیل کے لیے کافی ہوتا ہے۔ اور یہ ایک نہایت ہی چھوٹی سی مقدار ہوتی ہے جس کے لیے قرآن ''نطفہ'' کا لفظ استعمال کرتا ہے۔

قرآن مجید کی سورۂ سجدہ میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهُ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ﴾ [السجدہ: ۸]

''پھر اس کی نسل ایک ایسے ست سے چلائی جو حقیر پانی کی طرح کا ہے۔''

''ست یا سلالۃ'' سے مراد ہے کسی چیز کا جوہر، کسی شے کا بہترین حصہ۔ یا یوں کہیے کہ کروڑوں جرثوموں میں سے وہ ایک جرثومہ جو بیضے کو بارآور کرنے کا باعث بنتا ہے۔ قرآن اسی لیے تو یہاں لفظ ''سلالۃ'' یعنی بہترین حصہ استعمال کرتا ہے۔

سورۂ الدھر میں مزید ارشاد ہوتا ہے:

﴿اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا۝﴾ [الدھر: ۲]

''ہم نے انسان کو مخلوط نطفے سے پیدا کیا تا کہ اس کا امتحان لیں اور اس غرض کے لیے ہم نے اسے سننے اور دیکھنے والا بنایا۔''

یہاں قرآن ''نطفۃٍ امشاج'' کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ یعنی مخلوط نطفہ۔ گویا یہاں اشارہ بیضوں اور مادہ منویہ کی طرف ہے۔ کیونکہ جنین کی تشکیل کے لیے ان دونوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ جنین کے ارتقا کے مختلف مراحل کا ذکر قرآن بڑی تفصیل اور وضاحت کے ساتھ کرتا ہے۔

سورۂ مومنون میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۝ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۝ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ۝﴾ [المومنون: ۱۴-۱۲]

''ہم نے انسان کو مٹی کے ست سے بنایا پھر اسے ایک محفوظ جگہ ٹپکی ہوئی بوند میں تبدیل کیا، پھر اس بوند کو لوتھڑے کی شکل دی، پھر لوتھڑے کو بوٹی بنا دیا، پھر بوٹی کی ہڈیاں بنائیں، پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا، پھر اسے ایک دوسری ہی مخلوق بنا کر کھڑا کیا۔ پس بڑا ہی بابرکت ہے اللہ، سب کاریگروں سے اچھا کاریگر۔''

مندرجہ بالا آیات میں بتایا گیا کہ انسان کی تخلیق ہوئی نُطفَةٌ سے جو مائع کی انتہائی قلیل مقدار ہے۔

پھر اسے ''قرارٍ مَّکِینٍ'' میں رکھا گیا یعنی محفوظ جگہ پھر وہ ''علقه'' میں تبدیل ہوا یعنی ''جونک نما شے'' یا ''چپکنے والی شے'' یا ''خون کا لوتھڑا''۔

پھر علقه کو تبدیل کیا گیا ''مضغة'' میں، یعنی چبائی ہوئی شے یا بوٹی۔

پھر مضغة سے ''عظاماً'' یعنی ہڈیاں بنائی گئیں۔

پھر ''لحم'' یعنی گوشت کی تشکیل ہوئی۔

ان تین آیات قرآنی میں جنین کے ارتقائی مراحل بڑی وضاحت سے بیان کر دیے گئے ہیں۔ سب سے پہلے تو نطفه، قرار مکین میں پہنچتا ہے یعنی رحم مادر میں اور پھر وہ علقة میں تبدیل ہوتا ہے۔ لفظ ''علقة'' کے تین معانی ہیں: پہلا معنی تو ''چپکنے والی چیز'' ہے اور یہ معنی بالکل درست ہے کیونکہ جنین رحم کی دیوار کے ساتھ چپکا رہتا ہے۔ دوسرے معنی ''جونک نما شے'' ہیں۔ اور جیسا کہ پہلے بھی وضاحت کر چکا ہوں کہ جنین اپنے ابتدائی مراحل میں واقعی جونک سے مشابہ ہوتا ہے۔ شکل و صورت کے لحاظ سے بھی اور کچھ اس لحاظ سے بھی کہ جونک کی طرح اس کی پرورش بھی خون سے ہو رہی ہوتی ہے۔

تیسرے معانی ''خون کا لوتھڑا'' بھی ہوتے ہیں اور انھی معانی پر ڈاکٹر ولیم کیمپبل نے اعتراض کیا ہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ یہاں قرآن غلطی پر ہے۔ لیکن میں عرض کرنا چاہوں گا کہ قرآن ہرگز غلطی پر نہیں ہے بلکہ ڈاکٹر ولیم کیمپبل غلطی پر ہیں۔ کیونکہ آج، جب علم

طب اس قدر ترقی کر چکا ہے، آج بھی ڈاکٹر کیتھ مور، یہ تسلیم کرتے ہیں کہ جنین ابتدائی مراحل میں خون کے لوتھڑے کی مانند بھی نظر آتا ہے۔ آپ تصاویر کی مدد سے بھی اس بات کی تصدیق کر سکتے ہیں کہ علقہ تین سے چار ہفتے کی عمر میں لوتھڑے سے مشابہ نظر آتا ہے یا نہیں؟

ڈاکٹر کیمپبل کے تمام اعتراضات کا جواب ایک جملے میں بھی دیا جا سکتا ہے اور وہ جملہ یہ ہے کہ:

''قرآن میں جنین کے ارتقا کے مختلف مراحل کو ان کی شباہت کی بنا پر نام دیے گئے ہیں۔''

جنین بظاہر اسی طرح نظر آتا ہے جس طرح قرآن میں بیان کیا گیا ہے۔ پہلے مرحلے میں واقعی اس کی شباہت لوتھڑے، جونک یا چپکنے والی چیز کی طرح ہوتی ہے۔ پھر قرآن کہتا ہے کہ علقہ کو مضغہ میں تبدیل کیا جاتا ہے۔ یعنی وہ کسی چبائی ہوئی شے کی مانند ہو جاتا ہے اور یہ بات بھی درست ہے۔ ڈاکٹر کیتھ مور نے پلاسٹک کے ایک ٹکڑے کو دانتوں سے دبا کر دیکھا۔ ڈاکٹر مور لکھتے ہیں کہ علقہ کے مضغۃ میں تبدیل ہونے کے بعد بھی ''چپکاؤ'' موجود رہتا ہے تقریباً ساڑھے آٹھ ماہ کی عمر تک۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ قرآن کا بیان غلط ہے۔ قرآنی بیان بالکل درست ہے کیونکہ ''جیسا کہ میں نے پہلے کہا، قرآن نے یہ نام جنین کی ظاہری صورت کی بنا پر دیے ہیں، بے شک جنین تقریباً آخر تک ''چپکنے والی شے'' رہتا ہے لیکن اس کی ظاہری شباہت ''جونک نما چیز'' کی بجائے ''چبائی ہوئی چیز'' جیسی ہو جاتی ہے۔

اس کے بعد قرآن کہتا ہے کہ ''عِظامًا'' یعنی ہڈیاں اور پھر ''لَحمًا'' یعنی گوشت کی تشکیل ہوتی ہے۔ ڈاکٹر کیمپبل کا کہنا ہے کہ ہڈیوں اور پٹھوں کی تشکیل بیک وقت ہوتی ہے۔ میں ان سے اتفاق کرتا ہوں۔ واقعی اسی طرح ہوتا ہے۔

آج علم الجنین کی جدید تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ ہڈیوں اور پٹھوں کی ابتدائی تشکیل

چھبیسویں سے چالیسویں دن کے درمیان ہوتی ہے۔ اور بظاہر ایک ڈھانچے کی صورت نظر آنا شروع ہو جاتی ہے۔ لیکن پٹھوں یعنی گوشت کی تشکیل مکمل نہیں ہوئی ہوتی۔ یہ ساتویں اور آٹھویں ہفتے میں مکمل ہوتی ہے۔ جب کہ ہڈیاں بیالیسویں دن تک مکمل ہو چکی ہوتی ہیں، ڈھانچہ بن چکا ہوتا ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ قرآنی ترتیب بالکل درست ہے۔

یعنی سب سے پہلے **علقہ** پھر **مضغۃ** پھر **عظاماً** اور پھر **لحماً** قرآن کی بیان کردہ ترتیب ہی درست ترتیب ہے۔

ڈاکٹر کیتھ مور کا کہنا ہے کہ جدید علم الجنین کے بیان کردہ مراحل یعنی پہلا، دوسرا، تیسرا، چوتھا اور پانچواں مرحلہ اور ان کی تفاصیل انتہائی پیچیدہ اور عسیر الفہم ہیں۔ جب کہ صورت اور شباہت کی بنیاد پر بیان کردہ قرآنی مراحل سادہ اور آسانی سے سمجھ میں آنے والے ہیں۔ اسی لیے ڈاکٹر کیتھ مور کہتے ہیں کہ ''مجھے یہ بات ماننے پر کوئی اعتراض نہیں کہ محمد ﷺ خدا کے پیغمبر تھے کیونکہ قرآن مجید ایک الہامی کتاب ہی ہو سکتی ہے۔'' یعنی یہ معلومات کسی ایسی کتاب میں ہی ہو سکتی ہیں جو منزل من اللہ ہو۔

قرآن مجید کی سورۂ نساء میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِاٰیٰتِنَا سَوْفَ نُصْلِیْهِمْ نَارًا كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَیْرَهَا لِیَذُوْقُوا الْعَذَابَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَزِیْزًا حَكِیْمًا﴾ [النساء: ۵۶]

''جن لوگوں نے ہماری آیات کو ماننے سے انکار کر دیا، انھیں بالیقین ہم آگ میں جھونکیں گے اور جب ان کے بدن کی کھال گل جائے گی تو اس کی جگہ دوسری کھال پیدا کر دیں گے، تاکہ وہ خوب عذاب کا مزہ چکھیں۔ اللہ بڑی قدرت رکھتا ہے اور اپنے فیصلوں کو عمل میں لانے کی حکمت خوب جانتا ہے۔''

اس آیت کا تعلق ''درد کے احساس'' سے ہے۔ پہلے ڈاکٹر حضرات کا خیال تھا کہ درد کے احساس کا تعلق صرف دماغ کے ساتھ ہوتا ہے۔ لیکن آج ہم یہ جانتے ہیں کہ درد کا

احساس صرف دماغ کی وجہ سے نہیں ہوتا بلکہ ہماری جلد میں بھی ایسے ''Recepters'' موجود ہوتے ہیں جو درد اور تکلیف کا احساس پیدا کرتے ہیں، انھیں Pain Recepters کہا جاتا ہے۔ قرآن مجید کی مذکورہ بالا آیت میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ارشاد ہے کہ انکار کرنے والوں یعنی کفار کو آگ کے حوالے کیا جائے گا اور جب ان کی کھال جل جائے گی تو ان کے جسم پر نئی کھال پیدا کر دی جائے گی تا کہ انھیں دوبارہ درد کا احساس ہو سکے۔

اس آیت سے واضح طور پر پتہ چلتا ہے کہ جلد میں ایسی کوئی خصوصیت موجود ہے جس کی وجہ سے درد کا احساس ہوتا ہے۔ یعنی قرآن اس آیت میں Pain Recepters کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

تھائی لینڈ کی چانگ مائی یونیورسٹی کے شعبہ اناٹومی کے سربراہ پروفیسر تھاگاڈا شان صرف اس ایک آیت کی وجہ سے مسلمان ہو چکے ہیں۔ ریاض، سعودی عرب میں ہونے والی آٹھویں میڈیکل کانفرنس میں انھوں نے اعلان کیا:

أَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدً الرَّسُوْلُ اللّٰهِ

''میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمدؐ اللہ تعالیٰ کے پیغام بر ہیں۔''

اللہ سبحانہ وتعالیٰ قرآن مجید میں ارشاد فرماتے ہیں:

﴿سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌo﴾ [حم السجدہ: ۵۳]

''عنقریب ہم ان کو اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے اور ان کے اپنے نفس میں بھی، یہاں تک کہ ان پر یہ بات کھل جائے گی کہ یہ قرآن واقعی برحق ہے۔ کیا یہ بات کافی نہیں ہے کہ تیرا رب ہر چیز کا شاہد ہے۔''

ڈاکٹر تھاگاڈا کے لیے ایک ہی نشانی حق کی نشان دہی کے لیے کافی ہو گئی۔ یعنی اس بات پر ایمان لانے کے لیے کہ قرآن کلام خداوندی ہے۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جنھیں

دس نشانیاں درکار ہوں گی اور کچھ ایسے جنھیں سو نشانیاں درکار ہوں گی۔ لیکن کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو ایک ہزار نشانیاں دیکھ کر بھی ایمان نہیں لائیں گے۔

ایسے لوگوں کے بارے میں قرآن کہتا ہے:

﴿صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْىٌ فَهُمْ لَا یَرْجِعُوْنَۙ﴾ [البقرہ: ۱۸]

''یہ بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں، یہ اب نہ پلٹیں گے۔''

بائبل بھی متی کی انجیل میں ان کے بارے میں یہی کہتی ہے۔

''میں ان سے تمثیلوں میں اس لیے باتیں کرتا ہوں کہ وہ دیکھتے ہوئے نہیں دیکھتے اور سنتے ہوئے نہیں سنتے اور نہیں سمجھتے۔'' [متی باب ۱۳-۱۳]

جہاں تک علم الجنین سے متعلق دیگر نکات کا تعلق ہے، ان کا ذکر میں ان شاء اللہ اپنی جوابی تقریر میں کروں گا لیکن مجھے موضوع کے دوسرے حصے سے بھی انصاف کرنا ہے یعنی ''بائبل، سائنس کی روشنی میں''

سب سے پہلے میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ قرآن سے ہمیں یہ اطلاع ملتی ہے:

﴿لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ ۝ یَمْحُوا اللّٰهُ مَا یَشَآءُ وَ یُثْبِتُ ۖۚ وَ عِنْدَهٗۤ اُمُّ الْكِتٰبِ ۝﴾ [الرعد: ۳۸-۳۹]

''ہر دور کے لیے ایک کتاب ہے۔ اللہ جو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جس چیز کو چاہتا ہے، قایم رکھتا ہے، ام الکتاب اسی کے پاس ہے۔''

یعنی اللہ تعالیٰ نے بہت سی کتابیں نازل فرمائی ہیں۔ لیکن نام صرف چار کا مذکور ہے۔ تورات، زبور، انجیل اور قرآن۔ تورات بھی وحی خداوندی ہے اور زبور بھی۔ انجیل وہ وحی ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی اور قرآن اللہ تعالیٰ کی وہ وحی ہے جو اس کے آخری پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے آخری وحی ہے۔

یہاں ایک بات میں واضح طور پر بیان کر دینا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ جس انجیل کو آج کل مسیحی حضرات اپنی کتاب مقدسہ قرار دیتے ہیں، ہم مسلمانوں کے نزدیک یہ وہ انجیل نہیں

جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی۔ ہمارے خیال میں یہ ممکن ہے کہ اس انجیل میں کلامِ خداوندی بھی شامل ہو۔ لیکن اس میں دیگر کئی چیزیں بھی شامل ہیں۔ اس میں حواریوں کا کلام بھی شامل ہے۔ تاریخ دانوں کے بیانات بھی شامل ہیں اور کچھ بے معنی اور مہمل باتیں بھی۔ مزید برآں اس میں کچھ فحش بیانات اور لاتعداد سائنسی اغلاط بھی موجود ہیں۔ اگر بائبل میں کچھ باتیں سائنسی طور پر درست ہیں تو اس کا امکان موجود ہے کیونکہ بائبل میں کلامِ الٰہی کے شامل ہونے کا امکان ہم تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اغلاط کے بارے میں کیا کیا جائے؟

کیا آپ یہ پسند کرتے ہیں کہ ان اغلاط کو خدا کی طرف منسوب کیا جائے؟

میں یہ بات اپنے مسیحی بہن بھائیوں کے سامنے بالکل واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میری گفتگو کا مقصد کسی کی دل آزاری نہیں ہے۔ اگر بائبل اور سائنس پر گفتگو کرتے ہوئے میری کسی بات سے آپ کی دل آزاری ہو تو میں اس کے لیے پیشگی معذرت خواہ ہوں۔

ہماری گفتگو کا مقصد تو صرف یہ بتانا ہے کہ کلامِ خداوندی میں غلطی نہیں ہو سکتی۔ اس میں سائنسی غلطیوں کا امکان ہی نہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی یہی فرماتے تھے کہ سچائی کو تلاش کرو۔

دیکھیے ہمارے پاس عہد نامہ قدیم ہے، عہد نامہ جدید ہے اور خدا کی آخری وحی بھی ہمارے پاس قرآن کی صورت میں موجود ہے۔

جہاں تک ڈاکٹر ولیم کیمپبل کا تعلق ہے، ان کے ساتھ میں خاصی بے تکلفی برت سکتا ہوں کیونکہ وہ ایک کتاب لکھ چکے ہیں جس کا عنوان ہے ''قرآن اور بائبل تاریخ اور سائنس کی روشنی میں۔''

وہ ایک بیان دے چکے ہیں اور ویسے بھی وہ ایک ڈاکٹر ہیں لہٰذا ان کے معاملے میں مجھے تکلف برتنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے لیکن جہاں تک دوسرے مسیحی بہن بھائیوں کا تعلق ہے اگر دورانِ گفتگو ان کے جذبات مجروح ہوں تو ان سے میں معذرت خواہ ہوں۔

آیئے! اب ہم دیکھتے ہیں کہ بائبل، سائنس کے بارے میں کیا کہتی ہے؟

آغاز ہم فلکیات سے کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ بائبل ہمیں علم فلکیات کے بارے میں کیا بتاتی ہے۔ بائبل میں تخلیق کائنات کے بارے میں بات کی گئی ہے۔ بائبل کے آغاز میں ہی تخلیق کائنات کا ذکر موجود ہے یعنی پہلی کتاب، پیدائش میں بتایا گیا ہے:

''خدا نے ابتدا میں زمین و آسمان کو پیدا کیا، اور زمین ویران اور سنسان تھی اور گہراؤ کے اوپر اندھیرا تھا اور خدا کی روح پانی کی سطح پر جنبش کرتی تھی اور خدا نے دیکھا کہ روشنی اچھی ہے اور خدا نے روشنی کو تو دن کہا اور تاریکی کو رات اور شام ہوئی اور صبح ہوئی سو پہلا دن ہوا۔'' [پیدائش، باب ا......۵-ا]

بائبل ہمیں بتاتی ہے کہ خدا نے کائنات کو چھ دن میں پیدا کیا اور بائبل صبح اور شام کا بھی ذکر کرتی ہے یعنی چوبیس گھنٹے والے دن کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ سائنس دان ہمیں بتاتے ہیں کہ چوبیس گھنٹے والے چھ دنوں میں کائنات کی تشکیل ممکن ہی نہیں ہے۔

قرآن بھی اس حوالے سے چھ ایام کا ذکر کرتا ہے۔ عربی لفظ ایام ہے جس کا واحد یوم ہوتا ہے۔ لفظ یوم کا مطلب چوبیس گھنٹے کا ایک دن بھی ہوتا ہے اور اس سے مراد طویل عرصہ بھی ہو سکتا ہے یعنی ''ایک زمانہ۔'' اور یہ بات تسلیم کرنے میں کسی سائنس دان کو کوئی اعتراض نہ ہوگا کہ دنیا چھ ''طویل وقفوں'' یا ''زمانوں'' میں تخلیق ہوئی ہو۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ بائبل اپنی بالکل ابتدائی آیات یعنی آیات ۳ تا ۵ میں یہ بتاتی ہے کہ روشنی پہلے دن تخلیق ہوئی جب کہ روشنی کے اسباب سورج اور ستارے وغیرہ چوتھے دن تخلیق ہو رہے ہیں۔ اب یہ کس طرح ممکن ہے کہ روشنی کے اسباب و ذرائع چوتھے دن تخلیق ہوں جب کہ روشنی پہلے ہی دن تخلیق ہو چکی ہو۔ یہ ایک بالکل غیر سائنسی بات ہے۔ مزید برآں تیسرا نکتہ یہ ہے کہ آیات نمبر ۹ تا ۱۳ میں بتایا جا رہا ہے کہ زمین تخلیق ہوئی تو اگر زمین اس مرحلے میں تخلیق ہو رہی ہے تو صبح اور شام پہلے دن کس طرح تخلیق ہو گئے تھے۔ دن اور رات کا انحصار ہی زمین کی گردش پر ہے اور اگر زمین نہیں بنی تھی تو دن اور رات کا تصور ہی

ممکن نہیں تھا۔

چوتھا نکتہ یہ کہ کتاب پیدائش، پہلے باب کی آیات ۹ تا ۱۳ ہمیں بتاتی ہیں کہ زمین کی تشکیل تیسرے دن ہوئی تھی جب کہ آیات ۱۴ تا ۱۹ سے پتہ چلتا ہے کہ سورج اور چاند چوتھے دن بنائے گئے۔ لیکن جدید سائنس ہمیں بتاتی ہے کہ زمین دراصل سورج ہی کا ایک حصہ ہے، لہٰذا اس کا سورج سے پہلے تخلیق ہونا ممکن ہی نہیں ہے۔ یہ غیر سائنسی بات ہے۔

پانچواں نکتہ یہ ہے کہ کتاب پیدائش پہلے باب کی آیات نمبر ۹ تا ۱۳ ہمیں بتاتی ہیں کہ زمین پر گھاس اور بوٹیاں اور درخت تیسرے دن تخلیق ہوئے جب کہ سورج کی تشکیل چوتھے دن ہوئی جیسا کہ آیات ۱۴ تا ۱۹ میں درج ہے۔ سائنس کا سوال یہ ہے کہ سورج کی روشنی کے بغیر نباتات کی نشوونما اور بقا کس طرح ممکن ہے؟

چھٹا نکتہ یہ کہ کتاب پیدائش باب ۱، آیت ۱۷ میں کہا گیا ہے کہ:

''سو خدا نے دو بڑے نیر بنائے۔ ایک نیر اکبر کہ دن پر حکم کرے اور ایک نیر اصغر کہ رات پر حکم کرے اور اس نے ستاروں کو بھی بنایا۔''

اس آیت اور آیات ماقبل و مابعد سے پتہ چلتا ہے کہ چاند اور سورج دونوں روشن اجسام ہیں لیکن ہم جانتے ہیں کہ یہ بات مسلمہ سائنسی حقائق کے خلاف جاتی ہے۔

کچھ لوگ مطابقت پیدا کرنے کے لیے یہ موقف اختیار کرتے ہیں کہ بائبل میں بیان کردہ چھ دن بھی درحقیقت چھ زمانے ہیں لیکن ان کی یہ بات بھی غیر منطقی ہے۔ کیوں کہ آپ صاف دیکھ سکتے ہیں کہ بائبل میں صبح کا بھی ذکر ہو رہا ہے اور شام کا بھی جو اس بات کا ثبوت ہے کہ یہاں چوبیس گھنٹے والا دن ہی مراد ہے۔ لیکن بالفرض میں یہ غیر منطقی دلیل تسلیم کر بھی لوں تو اس طرح زیادہ سے زیادہ پہلے دو نکات کا جواب ملتا ہے جب کہ باقی ماندہ چار سوالات پھر بھی جواب طلب ہی رہ جاتے ہیں۔

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ اگر یہاں عام دن ہی مراد ہے تو پھر نباتات چوبیس گھنٹے روشنی کے بغیر بھی گزار سکتی ہیں۔ میں کہتا ہوں چلیے آپ کی یہ بات تسلیم کیے لیتے ہیں لیکن

اس طرح نباتات والا مسئلہ تو حل ہوتا ہے دیگر مسائل پھر جواب طلب رہ جاتے ہیں۔ آپ ''چت بھی میری، پٹ بھی میری'' والا رویہ نہیں اپنا سکتے۔

لہٰذا اب میں یہ بات ڈاکٹر ولیم کیمپبل پر چھوڑ دیتا ہوں۔ ان کے پاس دو صورتیں ہیں:

یا تو وہ یہ تسلیم کرلیں کہ دن سے مراد ایک طویل زمانہ ہے تو آپ پہلا اور تیسرا نکتہ حل کرلیں گے لیکن دوسرا، چوتھا، پانچواں اور چھٹا نکتہ حل طلب رہ جائے گا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ وہ دن کو ۲۴ گھنٹے کا عام دن ہی فرض کریں، اس صورت میں وہ صرف پانچویں نکتے کا جواب مہیا کردیں گے لیکن باقی تمام نکات حل طلب رہ جائیں گے۔

اب جہاں تک زمین کا تعلق ہے اس بارے میں متعدد سائنسی نظریات موجود ہیں۔ یہ نظریات محض مفروضے ہیں جو درست بھی ہو سکتے ہیں اور غلط بھی۔ لیکن یا تو زمین بالآخر فنا ہو جائے گی اور یا ہمیشہ موجود رہے گی۔ ان میں سے کوئی ایک نظریہ ہی درست ہو سکتا ہے دونوں باتیں بیک وقت درست نہیں ہوسکتیں۔ یہ ایک غیر سائنسی بات ہوگی۔

لیکن مسئلہ یہ ہے کہ بائبل یہی کہتی ہے یعنی دونوں باتوں کا ذکر کرتی ہے۔ عبرانیوں کے نام پولس رسول کے خط کے پہلے باب کی گیارھویں اور بارھویں آیت میں کہا گیا ہے:

''اے خداوند!
تو نے ابتدا میں زمین کی نیو ڈالی
اور آسمان تیرے ہاتھ کی کاریگری ہیں
وہ نیست ہو جائیں گے مگر تو باقی رہے گا
اور وہ سب پوشاک کی مانند پرانے ہو جائیں گے۔''

اسی طرح کتاب زبور کے باب نمبر ۱۰۲ میں کہا گیا:

''تو نے قدیم سے زمین کی بنیاد ڈالی
آسمان تیرے ہاتھ کی صنعت ہے

وہ نیست ہو جائیں گے پر تو باقی رہے گا۔''

لیکن دوسری طرف اس کے بالکل برعکس اور متضاد بیانات بھی بائبل میں موجود ہیں۔

''انسان کو اس ساری محنت سے جو وہ کرتا ہے کیا حاصل ہے؟

ایک پشت جاتی ہے اور دوسری پشت آتی ہے پر زمین ہمیشہ قایم رہتی ہے۔''

[واعظ، باب ۱......۳،۴]

اسی طرح زبور میں کہا گیا:

''اور اپنے مقدس کو پہاڑوں کی مانند تعمیر کیا اور زمین کی مانند

جسے اس نے ہمیشہ کے لیے قایم کیا ہے۔'' [زبور، باب ۷۸۔۶۹]

اب میں یہ بات ڈاکٹر ولیم کیمپبل پر چھوڑ دیتا ہوں کہ وہ خود انتخاب کر لیں کہ کون سی بات غلط ہے کیونکہ دونوں باتیں بیک وقت تو درست نہیں ہو سکتیں۔ دنیا بیک وقت فانی اور غیر فانی نہیں ہو سکتی ہے۔

اب ہم آسمان کی طرف آتے ہیں۔ بائبل میں کہا گیا ہے:

''اور آسمان کے ستون کانپتے ہیں

اور اس کی جھڑکی سے حیران ہوتے ہیں۔'' [ایوب، باب ۲۶۔۱۱]

جب کہ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِغَيْرِ عَمَدٍ﴾ [لقمٰن: ۱۰]

''اس نے آسمانوں کو پیدا کیا بغیر ستونوں کے۔''

بائبل کہتی ہے کہ آسمان کے ستون ہیں، قرآن کہتا ہے کہ آسمان بغیر ستونوں کے ہے، کیا آپ خود نہیں دیکھ سکتے کہ آسمان کے ستون موجود ہیں یا نہیں؟

بائبل نہ صرف یہ کہتی ہے کہ آسمان کے ستون ہیں بلکہ وہ تو زمین کے بارے میں بھی یہی بات کرتی ہے:

''زمین کے ستون خداوند کے ہیں

اس نے دنیا کو ان ہی پر قایم کیا ہے۔'' [سیموئیل۔ا، باب ۲۔۸]

''زمین اور اس کے سب باشندے گداز ہو گئے ہیں
میں نے اس کے ستونوں کو قایم کر دیا ہے۔'' [زبور، باب ۷۵۔۳]

''وہ زمین کو اس کی جگہ سے ہلا دیتا ہے
اور اس کے ستون کانپنے لگتے ہیں۔'' [ایوب، باب ۹۔۶]

اب ہم آتے ہیں غذائیات کی طرف۔ کتاب پیدائش میں کہا گیا:

''اور خدا نے کہا دیکھو میں تمام روئی، زمین کی کل بیج دار سبزی اور ہر درخت جس میں اس کا بیج دار پھل ہو، تم کو دیتا ہوں، یہ تمہارے کھانے کو ہوں۔''

[پیدائش، باب ا، ۲۹]

آج ایک عام آدمی بھی بخوبی جانتا ہے کہ کچھ بیج دار نباتات اس قدر زہریلی ہوتی ہیں کہ انھیں کھانے والا یقینی طور پر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ جب کہ بائبل کہتی ہے کہ ایسے تمام پھل کھانے کے لیے ہیں۔ میں امید رکھتا ہوں کہ ڈاکٹر کیمپبل اپنے مریضوں کو یہ پھل نہیں دیتے ہوں گے۔

بائبل میں ایک ایسا طریقہ کار بتایا گیا ہے جس کی مدد سے یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ کون حقیقی ایماندار ہے۔

''اور ایمان لانے والوں کے درمیان یہ معجزے ہوں گے۔
وہ میرے نام سے بدروحوں کو نکال لیں گے۔
نئی نئی زبانیں بولیں گے۔
سانپوں کو اٹھا لیں گے۔
اور اگر کوئی ہلاک کرنے والی چیز پئیں گے تو انھیں کوئی ضرر نہ پہنچے گا، وہ بیماروں پر ہاتھ رکھیں گے تو اچھے ہو جائیں گے۔'' [مرقس، باب ۱۶۔۱۸۔۱۷]

یہ ایک سائنسی ٹسٹ ہے۔ سائنس کی اصطلاح میں ہم اسے ایک Confirmatory

Test کہہ سکتے ہیں۔جس کے ذریعے ایک حقیقی مسیحی کا پتہ چلایا جا سکتا ہے۔

اپنی زندگی کے گزشتہ دس سالوں کے دوران میں، مجھے بلا مبالغہ ہزاروں عیسائیوں سے واسطہ پڑا ہے جن میں عیسائیت کے مبلغین بھی شامل تھے۔لیکن میں نے آج تک کوئی ایک بھی ایسا عیسائی نہیں دیکھا جو انجیل کے اس امتحان میں کامیاب ہو سکے۔ میں نے کوئی ایک بھی عیسائی نہیں دیکھا جو زہر کھائے لیکن اس پر زہر کام نہ کرے۔سائنسی اصطلاح میں ہم اس امتحان کو Falsification Test بھی کہہ سکتے ہیں یعنی اگر کوئی غلط آدمی یہ امتحان دے گا تو وہ ناکام ہو جائے گا۔اگر غلط آدمی زہر کھائے گا تو مر جائے گا۔کوئی غلط آدمی یہ امتحان دینے کی جرأت ہی نہیں کرے گا۔اگر آپ ایک حقیقی عیسائی نہیں ہیں تو آپ کبھی یہ امتحان نہیں دیں گے۔

میں نے ڈاکٹر ولیم کیمپبل کی کتاب ''The Quran & The Bible , In the Light of History & Science'' پڑھی ہے اور میرا خیال ہے کہ وہ ایک حقیقی مسیحی ہیں۔اور میری خواہش ہے کہ کم از کم وہ یہ امتحان ضرور دیں۔ میں ان سے یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ وہ کوئی خطرناک زہر کھا کر دکھائیں کیونکہ اس طرح تو ہمارا یہ مباحثہ ہی خراب ہو جائے گا۔ میں ان سے صرف یہ درخواست کروں گا کہ وہ ہمیں نئی زبانیں بول کر دکھائیں۔آپ میں سے بہت سے لوگ یہ جانتے ہوں گے کہ ہندوستان میں ایک ہزار سے زیادہ مختلف زبانیں اور لہجے موجود ہیں۔ان میں سے ۱۷ زبانیں ایسی ہیں جنھیں سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے۔ میں ڈاکٹر صاحب سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ صرف تین الفاظ ان ۱۷ زبانوں میں بول کر دکھائیں یعنی ''ایک سو روپے''

ڈاکٹر صاحب کی مدد کے لیے میں انھیں سو روپے کا نوٹ بھی پیش کر دیتا ہوں۔اس نوٹ پر یہ سترہ زبانیں موجود ہیں۔ انگریزی اور ہندی سمیت۔ انگریزی میں One Hundered Rupees تو وہ پڑھ ہی لیں گے۔ ہندی میں انہیں بتا دیتا ہوں ''ایک سو روپے''

اب باقی پندرہ زبانوں میں یہ تین الفاظ وہ بول دیں۔ میں جانتا ہوں کہ انجیل کے بیان کے مطابق انہیں یہ زبانیں بغیر کسی کی مدد کے بولنی چاہئیں لیکن میں ان کی مدد کر رہا ہوں کیوں کہ میں چاہتا ہوں کہ کوئی تو یہ ٹسٹ پاس کرے۔ میں نے تو آج تک کوئی ایسا شخص نہیں دیکھا جو یہ امتحان پاس کر سکے۔

لہٰذا میں یہ نوٹ انھیں پیش کرتا ہوں۔ وہ یہ تین الفاظ پندرہ زبانوں میں پڑھ دیں۔ ''ایک سو روپے۔''

اب ہم آبیات یا ''علم الآب'' Hydrology کا ذکر کرتے ہیں۔ بائبل میں کہا گیا ہے:

''میں اپنی کمان کو بادل میں رکھتا ہوں
وہ میرے اور زمین کے درمیان عہد کا نشان ہو گی
اور ایسا ہو گا کہ جب میں زمین پر بادل لاؤں گا
تو میری کمان بادل میں دکھائی دے گی
اور میں اپنے عہد کو جو میرے اور تمہارے
اور ہر طرح کے جاندار کے درمیان ہے، یاد کروں گا
اور تمام جان داروں کی ہلاکت کے لیے پانی کا طوفان پھر نہ ہو گا
اور کمان بادل میں ہو گی اور میں اس پر نگاہ کروں گا
تا کہ اس ابدی عہد کو یاد کروں جو خدا کے
اور زمین کے سب طرح کے جاندار کے درمیان ہے
پس خدا نے نوح سے کہا
کہ یہ اس عہد کا نشان ہے
جو میں اپنے اور زمین کے کل جانداروں کے درمیان قایم کرتا ہوں۔''

[پیدائش، باب ۹۔ ۱۷-۱۴]

مندرجہ بالا بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ طوفانِ نوح کے اترنے کے بعد یہ عہد خدا اور حضرت نوح علیہ السلام کے مابین ہوا اور اس کی نشانی کے طور پر فلک میں قوس قزح نظر آئی۔ یعنی اس سے پہلے قوس قزح نہیں ہوا کرتی تھی۔ لیکن یہ ایک غیر سائنسی بیان ہے۔ یہ بات کیوں کر تسلیم کی جاسکتی ہے کہ طوفانِ نوح علیہ السلام سے قبل بادل تو ہوتے تھے۔ بارش تو برستی تھی لیکن قوس قزح نہیں بنتی تھی۔ کیا اس وقت Law of Refraction موجود نہیں تھا؟ یقیناً حضرت نوح علیہ السلام کے دور سے پہلے بھی بے شمار مرتبہ قوس قزح بنتی رہی ہوگی۔

اب ہم آتے ہیں علم طب کی جانب۔ انجیل میں گھر کو کوڑھ کی وبا سے محفوظ کرنے کے لیے ایک طریقہ بتایا گیا ہے، جو کچھ یوں ہے:

''اور وہ اس گھر کو پاک قرار دینے کے لیے
دو پرندے اور دیودار کی لکڑی اور سرخ کپڑا اور زوفا لے
اور وہ ان پرندوں میں سے ایک کو مٹی کے کسی برتن میں
بہتے ہوئے پانی پر ذبح کرے
پھر وہ دیودار کی لکڑی اور زوفا اور سرخ کپڑے
اور اس زندہ پرندے کو لے کر
ان کو اس ذبح کیے ہوئے پرندے کے خون
میں اور بہتے ہوئے پانی میں غوطہ دے
اور سات بار اس گھر پر چھڑکے
اور اس پرندے کے خون سے
اور بہتے ہوئے پانی
اور زندہ پرندے، دیودار کی لکڑی اور زوفا اور
سرخ کپڑے سے اس گھر کو صاف کرے
اور اس زندہ پرندے کو شہر کے باہر

کھلے میدان میں چھوڑ دے

یوں وہ گھر کے لیے کفارہ دے تو گھر پاک ٹھہرے گا۔'' [احبار، باب ۱۴۔۴۹،۵۳]

یعنی گھر کو کوڑھ کے جراثیم سے پاک کرنے کے لیے اس میں خون چھڑکا جائے۔آپ جانتے ہیں کہ خون جراثیم کو پھیلانے کا بہترین ذریعہ ہے نہ کہ جراثیم کو ختم کرنے کا۔ مجھے اُمید ہے کہ ڈاکٹر کیمپبل اس طریقہ سے اپنے آپریشن تھیٹر کی صفائی نہیں کرتے ہوں گے۔

ہم سب جانتے ہیں کہ نفاس کا خون، وہ خون جو بچے کی پیدائش کے دوران یا اس کے بعد آتا ہے ناپاک ہوتا ہے لیکن بائبل اس بارے میں کہتی ہے:

''اور خداوند نے موسیٰ سے کہا

بنی اسرائیل سے کہہ کہ

اگر کوئی عورت حاملہ ہو اور اس کا لڑکا ہو

تو وہ سات دن ناپاک رہے گی

جیسے حیض کے ایام میں رہتی ہے

اور آٹھویں دن لڑکے کا ختنہ کیا جائے

اس کے بعد تینتیس دن تک وہ طہارت کے خون میں رہے اور جب تک اس کی طہارت کے ایام پورے نہ ہوں تب تک نہ تو کسی مقدس چیز کو چھوئے

اور نہ مقدس مقام میں داخل ہو۔

اور اگر اس کے لڑکی ہو

تو وہ دو ہفتے ناپاک رہے گی

جیسے حیض کے ایام میں رہتی ہے

اس کے بعد چھیاسٹھ دن تک وہ طہارت کے خون میں رہے۔''

[احبار۔ باب ۱۲۔ ۱،۶]

یعنی اگر وہ بیٹے کو جنم دیتی ہے تو چالیس دن ناپاک رہے گی لیکن اگر وہ بیٹی کو جنم دیتی ہے تو پورے اسی دن تک ناپاک رہے گی۔ میں ڈاکٹر کیمپبل سے درخواست کروں گا کہ وہ وضاحت فرمائیں کہ اس کی کیا وجہ ہے؟ سائنسی طور پر عورت بیٹی پیدا ہونے کی صورت میں دگنے عرصے تک کیوں ناپاک رہتی ہے۔

انجیل میں کسی عورت کی بدکرداری ثابت کرنے کے لیے بھی ایک امتحان بیان کیا گیا ہے۔ اس کی تفصیل گنتی کے باب نمبر ۵ کی آیات ۱۱ تا ۳۱ میں موجود ہے۔ میں اس کا خلاصہ بیان کرتا ہوں۔

> ''اگر کسی کی بیوی گمراہ ہو کر اس سے بے وفائی کرے ...... پر نہ تو کوئی شاہد ہو اور نہ وہ عین فعل کے وقت پکڑی گئی ہو ...... تو وہ شخص اپنی بیوی کو کاہن کے پاس لائے ...... اور کاہن مٹی کے ایک برتن میں مقدس پانی لے ...... اور مسکن کے فرش کی گرد لے کر اس پانی میں ڈالے ...... اور وہ کڑوا پانی اس عورت کو پلائے ...... جب وہ اس کو پانی پلا چکے گا تو ایسا ہوگا کہ اگر وہ ناپاک ہوئی ...... تو وہ پانی جو لعنت کو لاتا ہے اس کے پیٹ میں جا کر کڑوا ہو جائے گا، اس کا پیٹ پھول جائے گا، اس کی ران سڑ جائے گی ...... پر اگر وہ ناپاک نہیں ہوئی بلکہ پاک ہے تو بے الزام ٹھہرے گی اور اس سے اولاد ہوگی۔''

[گنتی۔ باب نمبر ۵۔ ۱۱،۳۱]

آپ جانتے ہیں آج کل عدالتوں میں اس قسم کے بے شمار کیس پوری دنیا میں فیصلے کے منتظر ہیں۔ جن میں عورت پر اس شک کا اظہار کیا گیا ہے کہ وہ بدکردار ہے۔ بلکہ مجھے اخبارات سے معلوم ہوا ہے کہ اس عظیم ملک امریکہ کے صدر جناب بل کلنٹن پر بھی چند سال پہلے اس قسم کے الزامات لگائے گئے تھے۔ میں سوچتا ہوں کہ امریکی عدالتیں ایسے مواقع پر انجیل میں بتایا گیا یہ امتحان کیوں نہیں لیتیں؟

ریاضی بھی سائنس کا ایک شعبہ ہے اور انتہائی اہم شعبہ ہے۔ اس حوالے سے دیکھا

جائے تو بائبل میں ہمیں سینکڑوں تضادات نظر آتے ہیں۔ میں ان میں سے صرف چند ہی کا ذکر کروں گا۔

جب بنی اسرائیل کو بابل سے رہائی ملی تو وہ واپس آئے۔ ان کی فہرست بائبل میں موجود ہے۔ عزرا کے دوسرے باب کی آیات نمبر ۲ تا ۶۳ اور نحمیاہ باب نمبر ۷ آیات ۷ تا ۶۵۔ ان آیات میں مکمل فہرست دی گئی ہے۔ لیکن ان دونوں فہرستوں میں کم از کم ۱۸ جگہ تضادات موجود ہیں۔

مزید برآں کتاب عزرا میں کل تعداد بیالیس ہزار تین سو ساٹھ بتائی گئی ہے جب کہ نحمیاہ میں بھی کل تعداد یہی بتائی گئی ہے یعنی بیالیس ہزار تین سو ساٹھ لیکن جب میں نے خود اس تعداد کو جمع کیا تو جواب بالکل مختلف تھا۔

یعنی عزرا میں بیان کی گئی تعداد انتیس ہزار آٹھ سو اٹھارہ بنتی ہے۔ اسی طرح نحمیاہ میں بیان کی گئی تعداد کو جمع کیا جائے تو وہاں بھی میزان اکتیس ہزار انا نوے (۳۱،۰۸۹) آئے گا۔

اگر بائبل کا مصنف سیدھا سادا میزان بھی نہیں کر سکتا تھا تو کیا اس کتاب کو خدا کی جانب سے نازل کردہ تسلیم کیا جا سکتا ہے؟ نعوذ باللہ

آگے چلیے۔ عزرا میں کہا گیا ہے کہ:

''ان کے ساتھ دو سو گانے والے اور گانے والیاں تھیں۔''

جب کہ نحمیاہ میں کہا جا رہا ہے:

''اور ان کے ساتھ دو سو پینتالیس گانے والے اور گانے والیاں تھیں۔''

اب آپ ہی بتائیے کہ یہ تعداد دو سو تھی یا دو سو پینتالیس؟ کیوں کہ بات ایک ہی سیاق و سباق میں ہو رہی ہے لیکن ریاضیاتی تضاد موجود ہے۔ اسی طرح سلاطین ۲ کے باب نمبر ۲۴ میں تحریر ہے:

''اور یہویاکین جب سلطنت کرنے لگا تو اٹھارہ برس کا تھا اور یروشلم میں اس

نے تین مہینے سلطنت کی۔" [آیت نمبر ۸]

لیکن تواریخ ۔۲ کے باب نمبر ۳۶ میں کہا جارہا ہے:

"یہویا کین آٹھ برس کا تھا جب وہ سلطنت کرنے لگا اور اس نے تین مہینے دس دن حکومت کی۔" [آیت نمبر ۹]

تضاد بالکل واضح ہے۔ میں ڈاکٹر کیمپبل سے پوچھنا چاہوں گا کہ جب یہویا کین نے سلطنت شروع کی تو اس کی عمر آٹھ برس تھی یا اٹھارہ برس؟ اور یہ بھی کہ اس نے حکومت ۳ مہینے کی یا تین مہینے اور دس دن؟

مزید برآں بائبل میں ہیکل سلیمانی کا ذکر کرتے ہوئے سلاطین ۔۱ کے باب ۷ کی آیت نمبر ۲۶ میں تحریر ہے:

"اور دل اس کا چار انگل تھا اور اس کا کنارہ پیالہ کے کنارہ کی طرح گلِ سوسن کے مانند تھا اور اس میں دو ہزار بت کی سمائی تھی۔"

دوسری جگہ یعنی تواریخ ۔۲، باب ۴، آیت ۵ میں ہیکل سلیمانی ہی کے ذکر میں یہ بات اس طرح مذکور ہے:

"اور اس کی موٹائی چار انگل کی تھی اور اس کا کنارہ پیالہ کے کنارہ کی طرح اور سوسن کے پھول سے مشابہ تھا۔ اس میں تین ہزار بت کی سمائی تھی۔"

اب میں ڈاکٹر کیمپبل پر چھوڑتا ہوں۔ وہ ہمیں بتائیں کہ وہاں تین ہزار بت کی سمائی تھی یا دو ہزار بت کی؟

یہاں ایک واضح ریاضیاتی تضاد ہمارے سامنے موجود ہے۔

آگے چلیے، سلاطین ۔۱ کے باب نمبر ۱۵ کی آیات ۳۳، ۳۴ پڑھیے۔ یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہِ یہوداہ آسا کے چھبیسویں سال بعشا مر گیا تھا اور اس کی جگہ اس کا بیٹا ایلہ حکومت کرنے لگا۔

لیکن تواریخ ۔۲ کا سولھواں باب پڑھنا شروع کیجیے۔ یہاں کہا گیا ہے کہ آسا کے

چھتیسویں برس بعشا نے یہوداہ پر حملہ کیا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بعشا اپنی موت کے دس سال بعد کس طرح یہوداہ پر چڑھائی کر سکتا ہے؟ یہ ایک بالکل غیر سائنسی بات ہے۔

ڈاکٹر ولیم کیمپبل کی آسانی کے لیے میں اپنی گفتگو کا خلاصہ بیان کر دیتا ہوں تاکہ وہ اس کا جواب دے سکیں۔

پہلا نکتہ یہ کہ بائبل کے بیان کے مطابق کائنات چھ دنوں میں یعنی چوبیس گھنٹے والے دنوں میں تخلیق ہوئی جو کہ ظاہر ہے کہ غیر سائنسی بات ہے۔

دوسرا یہ کہ بائبل کے بیان کے مطابق روشنی کی تخلیق سورج اور ستاروں سے پہلے ہوئی تھی، یہ بات بھی غیر منطقی ہے۔

تیسرا نکتہ یہ تھا کہ دن اور رات کی تشکیل زمین کے تخلیق ہونے سے قبل ممکن نہیں لیکن بائبل ایسا ہی ظاہر کرتی ہے۔

چوتھا نکتہ میں نے یہ بیان کیا تھا کہ بائبل کے مطابق نباتات کی تخلیق سورج سے قبل ہو گئی تھی۔ یہ غیر سائنسی بیان ہے کیوں کہ پودوں کو اپنی نشوونما کے لیے سورج کی روشنی درکار ہوتی ہے۔

پانچویں بات میں نے یہ کی کہ زمین کی تخلیق سورج سے قبل بتائی گئی ہے اور یہ بات سائنس کی روشنی میں بالکل درست نہیں۔

چھٹا نکتہ یہ تھا کہ بائبل کے بیان کے مطابق چاند کی روشنی اس کی اپنی روشنی ہے۔

ساتواں نکتہ یہ تھا کہ زمین ہمیشہ قایم رہے گی یا فنا ہو جائے گی؟

آٹھواں نکتہ یہ کہ بائبل میں زمین کے ستون بیان کیے گئے ہیں۔

نوواں یہ کہ آسمان کے بھی ستون بتائے گئے ہیں۔

دسواں یہ کہ بائبل کے بیان کے مطابق تمام بیج دار پھل انسان کے کھانے کے لیے بنائے گئے ہیں لیکن ہم جانتے ہیں کہ ان میں کئی انتہائی زہریلے بھی ہوتے ہیں۔

گیارھویں بات میں نے یہ کی تھی کہ بائبل میں ایک امتحان بتایا گیا ہے جس سے ایک سچے مسیحی کا ایمان معلوم کیا جا سکتا ہے۔ کیا کوئی مسیحی یہ امتحان دینے کے لیے تیار ہے؟

بارھواں نکتہ یہ تھا کہ بیٹی کی پیدائش کی صورت میں ماں دگنے عرصے تک کیوں ناپاک رہتی ہے؟

تیرھواں نکتہ یہ تھا کہ بائبل میں مکان کو کوڑھ کی وبا سے محفوظ رکھنے کے لیے خون چھڑکنے کا مشورہ دیا گیا ہے جو کہ قطعاً غیر سائنسی ہے۔

چودھواں نکتہ یہ کہ بدکرداری معلوم کرنے کے لیے جو کڑوے پانی کا امتحان بیان کیا گیا ہے اس کی وضاحت کی جائے۔

پندرھواں نکتہ یہ کہ بائبل میں ایک ہی جگہ ساٹھ سے بھی کم آیات میں اٹھارہ تضادات موجود ہیں۔ اور میں اسے ایک ہی نکتہ یا ایک ہی سوال گن رہا ہوں، حالانکہ یہ اٹھارہ نکات ہیں۔

سولھواں نکتہ یہ کہ مندرجہ بالا معاملے میں دونوں جگہ تعداد مختلف ہے یعنی ایک تو بیان کردہ کل تعداد غلط ہے اور دوسرے دونوں ابواب میں میزان مختلف نکلتا ہے۔

سوال نمبر سترہ یہ ہے کہ مندرجہ بالا موقع پر یعنی بابل سے بنی اسرائیل کی رہائی کے موقع پر گانے والوں اور گانے والیوں کی تعداد دو سو تھی یا دو سو پینتالیس؟

اٹھارواں سوال یہ کہ جب یہویاکین نے سلطنت شروع کی تو اس کی عمر اٹھارہ سال تھی یا آٹھ سال؟

انیسواں سوال یہ ہے کہ اس نے حکومت تین ماہ کی تھی یا تین ماہ اور دس دن؟

بیسواں نکتہ یہ کہ ہیکل سلیمانی میں ''دو ہزار بت کی سمائی تھی'' یا ''تین ہزار بت'' کی؟

اکیسواں سوال یہ کہ بعشا اپنی موت کے دس سال بعد کیوں کر یہوداہ پر چڑھائی کر سکتا تھا؟

بائیسواں نکتہ یہ تھا کہ قوس قزح کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ یہ طوفان نوح کے بعد خدا کے وعدے کی نشانی کے طور پر ظاہر ہوئی۔

میں نے بائبل میں موجود سینکڑوں سائنسی اغلاط میں سے صرف بائیس کی نشان دہی کی ہے۔ میں ڈاکٹر ولیم کیمپبل سے درخواست کروں گا کہ وہ ان کا جواب دیں۔ وہ منطقی اور سائنسی طور پر ان ۲۲ نکات کا جواب کبھی نہیں دے سکیں گے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ہمارا بھی ایمان ہے۔ انھیں انجیل عطا کی گئی تھی۔ لیکن یہ وہ انجیل نہیں ہے۔ شاید اس میں جزوی طور پر وحی خداوندی موجود ہو لیکن مجموعی طور پر وہ انجیل ہرگز نہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی۔ اس کا غیر سائنسی اور غیر منطقی حصہ ہرگز منزل من اللہ نہیں ہے۔

میں اپنی گفتگو کا اختتام اس آیت قرآنی پر کرنا چاہوں گا:

﴿فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَ وَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ۝﴾ [البقرہ: ۷۹]

"پس ہلاکت اور تباہی ہے ان لوگوں کے لیے جو اپنے ہاتھوں سے شرع کا نوشتہ لکھتے ہیں پھر لوگوں سے کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے پاس سے آیا ہوا ہے۔ تاکہ اس کے معاوضے میں تھوڑا سا فایدہ حاصل کرلیں۔ ان کے ہاتھوں کا یہ لکھا بھی ان کے لیے تباہی کا سامان ہے اور ان کی یہ کمائی بھی ان کے لیے موجب ہلاکت۔"

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

☆.........☆.........☆

جوابی خطاب

ڈاکٹر ولیم کیمپبل

دیکھیے، ڈاکٹر ذاکر نائیک کچھ حقیقی نوعیت کے مسائل سامنے لائے ہیں۔ جہاں تک قرآن کا تعلق ہے میں ان کے جواب سے اتفاق نہیں کرتا۔ یعنی جہاں تک "علقة" اور "مضغة" کے الفاظ کا تعلق ہے، میرا اب بھی یہی خیال ہے کہ یہ ایک اہم مسئلہ ہے لیکن ظاہر ہے کہ ان کا ایک نقطۂ نظر ہے اور میرا بھی ایک نقطہ نظر ہے۔ دونوں نقطہ ہائے نظر سننے کے بعد ہر کسی کو گھر جا کر خود اس مسئلے پر غور کرنا چاہیے۔

جہاں تک زہر والے امتحان کا تعلق ہے، میں کسی ایسے شخص کو تو آپ کے سامنے پیش نہیں کر سکتا جو یہ امتحان دے چکا ہو، کیوں کہ وہ شخص فوت ہو چکا ہے لیکن میں اس کا واقعہ آپ کے سامنے بیان کر سکتا ہوں۔

میرے ایک دوست جن کا نام ہیری رینکلف تھا، وہ مراکش کے جنوبی علاقے کے ایک قصبے میں رہائش پذیر تھے۔ اسی قصبے کے ایک شخص نے جسے وہ اپنا دوست سمجھتے تھے، ان کی دعوت کی۔ اس نے ان کی بیوی اور بیٹے کو بھی اس دعوت میں مدعو کیا۔ ہیری نے یہ دعوت قبول کر لی۔ لیکن بعد میں کسی شخص نے آ کر انھیں بتایا کہ وہ شخص انھیں زہر دینا چاہتا ہے۔ اس کے باوجود وہ اس دعوت میں گئے۔ ہیری نے مذکورہ آیت کی روشنی میں فیصلہ کیا کہ اسے وہاں جانا چاہیے۔ لہٰذا وہ دعوت میں گئے۔ انھوں نے کوشش کی کہ اگر موقع ملے تو وہ پلیٹیں تبدیل کر دیں۔ لیکن انھیں یہ موقع نہ مل سکا۔ البتہ اپنے بیٹے کو وہ اچھی طرح کھانا کھلا کر لے گئے تھے۔ ان کی بیوی نے بھی زیادہ کھانا نہیں کھایا۔ لیکن ہیری کو کھانا ہی پڑا۔ اس رات ہیری کے معدے میں تکلیف ہوئی اور کچھ دیگر مسائل بھی ہوئے لیکن وہ

زندہ رہا۔ دو دن بعد ہیری اُس شخص کے گھر گیا، دروازے پر دستک دی۔ جب وہ باہر آیا تو ہیری کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ لیکن ہیری دعوت کا شکریہ ادا کر کے واپس آ گیا۔

چوں کہ یہ واقعہ مجھے یاد آ گیا تھا، لہٰذا میں نے سوچا آپ کو سنا ہی دیا جائے۔

اچھا، ایک بات آپ نے یہ کی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو صرف یہودیوں کی طرف بھیجا گیا تھا اور دیگر اقوام کی طرف نہیں۔

لیکن خود قرآن میں کہا گیا ہے:

﴿وَلِنَجْعَلَهُۥٓ ءَايَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا وَكَانَ أَمْرًا مَّقْضِيًّا ۝﴾

[مریم: ۲۱]

''اور ہم یہ اس لیے کریں گے کہ اس لڑکے کو لوگوں کے لیے ایک نشانی بنائیں اور اپنی طرف سے رحمت۔'' [مریم:۲۱]

اسی طرح انجیل میں کہا گیا ہے:

''یسوع نے پاس آ کر ان سے باتیں کیں اور کہا آسمان اور زمین کا کل اختیار مجھے دیا گیا ہے۔ پس تم جا کر سب قوموں کو شاگرد بناؤ اور ان کو باپ اور بیٹے اور روح القدس کے نام سے بپتسمہ دو۔'' [متی باب ۲۸۔۱۹،۱۸]

لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے شاگردوں کو صرف یہودیوں کی طرف جانے کے لیے بھی کہا تھا اور اس میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ کیوں کہ یہودیوں کو ایک یقینی موقع دیا جانا تھا۔

انجیل میں ایک کہانی بیان کی گئی ہے...... بلکہ شاید مجھے ''کہانی'' کا لفظ استعمال نہیں کرنا چاہیے، یہ تو تاریخ ہے...... ہاں تو حکایت کچھ یوں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک انجیر کے درخت کے پاس آئے۔ اس درخت پر تین سال سے پھل نہیں آیا تھا۔ جب پوچھا گیا کہ کیا اس درخت کو اُکھاڑ پھینکا جائے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا کہ ''نہیں'' ایک سال مزید انتظار کرو اور دیکھو، شاید یہ درخت پھل لے آئے۔

یہ ایک تمثیل تھی، بنی اسرائیل کے بارے میں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تین سال تک انھیں تبلیغ کی تھی اور چھ ماہ تک مزید تبلیغ کرنی تھی۔ اسی طرح مزید تمثیلات بھی موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ نعمت ان سے لے کر غیر اقوام کے حوالے کردی جائے گی۔

ڈاکٹر نائیک نے ''دن'' کے ضمن میں ''زمانوں'' کے بارے میں بھی بات کی ہے۔ بائبل میں ''دن'' کے لفظ سے مراد ایک طویل زمانہ بھی ہوسکتا ہے۔ ضروری نہیں کہ اس سے چوبیس گھنٹے والا دن ہی مراد ہو جیسا کہ ڈاکٹر موریس بوکائیے نے اپنی کتاب میں ثابت کرنا چاہا ہے۔ میرا خیال یہی ہے کہ اس سے طویل زمانے مراد ہیں۔ دیگر مسائل بھی ہیں جن کا ذکر ڈاکٹر نائیک نے کیا ہے، میں تسلیم کرتا ہوں کہ یہ مسائل موجود ہیں اور ان کے مناسب جوابات میرے پاس نہیں ہیں۔

لیکن میں یہاں اس حوالے سے بات ضرور کرنا چاہوں گا کہ ڈاکٹر صاحب نے دو طرح کے پانی کا ذکر کیا، نمکین یا کھاری پانی اور میٹھا پانی۔ میں اس سلسلے میں ان کی وضاحت سے بالکل مطمئن نہیں ہوں۔ قرآن یہ کہتا ہے کہ دو طرح کے پانی ہیں جو اکٹھے ہوتے ہیں لیکن ان کے درمیان ایک روک ہوتی ہے جو انھیں ملنے نہیں دیتی۔ یہاں روک یا رکاوٹ کے لیے قرآن نے جو لفظ استعمال کیا ہے، وہ ہے برزخ، برزخ کے معانی وقفہ، رکاوٹ، فاصلہ وغیرہ ہوتے ہیں۔

یہی بات سورۂ فرقان میں بھی کہی گئی ہے:

﴿وَهُوَ الَّذِیْ مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ وَجَعَلَ بَیْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا﴾ [الفرقان: ۵۳]

''اور وہی ہے جس نے دو سمندروں کو ملا رکھا ہے، ایک لذیذ و شیریں، دوسرا تلخ و شور، اور دونوں کے درمیان، ایک پردہ حائل ہے، ایک رکاوٹ ہے جو دونوں کو گڈمڈ ہونے سے روکے ہوئے ہے۔''

یہاں عربی کے دو الفاظ استعمال ہوئے ہیں، جن کا مادہ ایک ہی ہے اور ایسا عربی

زبان میں اس وقت کیا جاتا ہے جب کسی بات پر زور دیا جانا مقصود ہو۔ تاکید مطلوب ہو لہٰذا یہاں ترجمہ یہی ہونا چاہیے کہ کوئی باقاعدہ روک ہے جو کہ دونوں طرح کے پانیوں کے مابین موجود ہے۔

لیکن میرے دوست نے کہا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ دونوں طرح کے پانی الگ الگ رہتے ہیں۔ یعنی نمکین پانی اور تازہ پانی ایک دوسرے سے علیحدہ رہتے ہیں۔ ڈاکٹر بوکائیے نے بھی اس حوالے سے کافی بحث کی ہے اور تسلیم کیا ہے کہ سمندر میں آگے جا کر بالآخر پانی آپس میں مل جاتے ہیں۔ بات صرف یہ ہے کہ اتنی زیادہ مقدار میں پانی کو حل ہونے کے لیے کچھ وقت درکار ہوتا ہے۔

ایک چھوٹی سی مثال میں ذاتی طور پر بھی پیش کر سکتا ہوں۔ تیونس میں میرا ایک دوست ہے جو آکٹوپس پکڑتا ہے۔ ایک دفعہ میں اس سے ملنے گیا۔ میں پانی میں تیر رہا تھا۔ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ پانی اوپر سے ٹھنڈا اور نیچے سے گرم ہے۔ میں حیران ہوا کہ یہ کیوں کر ممکن ہے۔

غور کرنے پر اندازہ ہوا کہ قریب ہی ایک ندی آ کر سمندر میں گر رہی تھی۔ ٹھنڈا پانی ندی کا تھا اور گرم پانی سمندر کا۔ سمندری پانی چوں کہ نمکین ہونے کی وجہ سے بھاری ہوتا ہے، لہٰذا وہ نیچے تھا اور تازہ پانی ہلکا ہونے کی وجہ سے اوپر تھا۔ یہی معاملہ ہوتا ہے۔ رکاوٹ کوئی نہیں ہوتی۔

ڈاکٹر صاحب نے زبانوں کی بات کی اور ظاہر ہے میں ہندوستانی زبانیں نہیں بول سکتا بلکہ میں امریکی ہندیوں (Red Indians) کی زبانیں بھی نہیں بول سکتا لہٰذا امریکہ اور ہندوستان سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن بات یہ ہے کہ انجیل کے جس مقام کے بارے میں وہ بات کر رہے ہیں وہاں بات حواریوں کے بارے میں ہو رہی ہے جنہیں یہ صلاحیت ایک معجزے کے طور پر دی گئی تھی۔ لیکن یہ وہ زبانیں تھیں جو وہاں کے موجود لوگ بولا کرتے تھے۔ اس سے مراد دنیا بھر کی چھوٹی اور گمنام زبانیں نہیں۔ ہوتا یہ تھا کہ اگر کوئی شخص

سپین سے آیا ہے تو حواری اس کے ساتھ سپین کی زبان میں گفتگو کرتا تھا، اگر کوئی دوسرا شخص ترکی سے آیا ہے تو اس کے ساتھ اس کی زبان میں گفتگو کی جاتی تھی۔

.... اب ہم بات کریں گے پیش گوئیوں کے بارے میں۔ ایک سچے نبی کو پہچاننے کا طریقہ یہ بھی ہے کہ کیا اس کی پیش گوئیاں سچ ثابت ہوئیں؟ آپ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بھی یہ سوال کر سکتے ہیں کہ کیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیش گوئیاں پوری ہوئیں؟ کیا، ان سے معجزات کا صدور ہوا؟

ہم پیش گوئیوں کا ریاضیاتی تجزیہ کریں گے۔ اس نظریے کو Theory of Probabilities بھی کہتے ہیں۔ میں ایک مثال پیش کرتا ہوں۔

فرض کیجیے ڈاکٹر ذاکر نائیک کے پاس دس قمیصیں ہیں اور ان میں سے ایک کا رنگ سرخ ہے۔ اب میں پیش گوئی کرتا ہوں کہ "کل ڈاکٹر ذاکر نائیک سرخ قمیص پہنیں گے۔" اور فرض کیجیے اگلے دن واقعی ڈاکٹر نائیک سرخ قمیص پہنتے ہیں۔ اگر میں اپنی اس پیش گوئی کی بنیاد پر نبوت کا دعویٰ کروں تو کیا ہوگا؟ میرا ہر دوست کہے گا کہ نہیں نہیں، یہ تو محض اتفاق ہے۔

لیکن فرض کیجیے میں ایسی ہی پیش گوئی ڈاکٹر سمویل نعمان کے بارے میں بھی کر دیتا ہوں کہ وہ اپنی تین جوتیوں میں سے کل کون سی جوتی پہنیں گے، اسی طرح ڈاکٹر سہیل احمد کے بارے میں بھی پیش گوئی کر دیتا ہوں کہ وہ اپنی پانچ ٹوپیوں میں سے کل کون سی ٹوپی پہنیں گے تو میری ان تین پیش گوئیوں کے بیک وقت درست ثابت ہونے کے امکانات کس قدر ہیں؟

یہ امکان ڈیڑھ سو میں ایک ہے۔ ہم یہاں دس پیش گوئیوں کا ذکر کریں گے۔ ہمارے پاس وقت محدود ہے، اس لیے صرف دس پیش گوئیوں کا ذکر کیا جائے گا۔

پہلی پیش گوئی یرمیاہ کی ہے۔ ۶۰۰ قبل مسیح میں پیش گوئی کر دی گئی کہ مسیح کا تعلق داؤد کی نسل سے ہوگا۔ یرمیاہ میں بتا دیا گیا کہ داؤد کی نسل سے ایک بادشاہ کے آنے کا وقت

آرہا ہے جو یہوواہ کہلائے گا۔ یہ پیش گوئی پوری ہوئی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام ابن مریم پیدا ہوئے۔ بنی اسرائیل میں اولادِ داؤد کا تناسب میرے خیال میں دو سو میں ایک تھا۔ یعنی اس پیش گوئی کے پورا ہونے کا امکان دو سو میں ایک ہی تھا۔

دوسری پیش گوئی کہ دائمی حکومت کرنے والا بیت اللحم میں پیدا ہوگا۔ یہ بات میکاہ میں کی گئی یعنی ۷۵۰ ق م میں۔ اب یہ دیکھیے کہ بیت اللحم میں پیدا ہونے کے امکانات کیا ہیں، اگر حساب لگایا جائے تو........ تقریباً ۲۸۰ میں سے ایک امکان یہ ہے۔

تیسری پیش گوئی ملاکی کے تیسرے باب میں کی گئی ہے:

''دیکھو میں رسول کو بھیجوں گا اور وہ میرے آگے راہ درست کرے گا اور خداوند جس کے تم طالب ہو، ناگہاں اپنی ہیکل میں آموجود ہوگا، ہاں عہد کا رسول جس کے تم آرزومند ہو۔''

یہ بات ۴۰۰ ق م کی ہے۔ یحییٰ ابن زکریا نے بھی یہی پیش گوئی کی۔ قرآن بھی اس کی تائید کرتا ہے۔ سورۂ آل عمران میں کہا گیا ہے:

﴿فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ هُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ سَيِّدًا وَّ حَصُوْرًا وَّ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ٥ قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّ قَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ وَ امْرَاَتِيْ عَاقِرٌ قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ٥ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّ سَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَ الْاِبْكَارِ ٥ وَ اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ وَ طَهَّرَكِ وَ اصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ٥ يٰمَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ وَ اسْجُدِيْ وَ ارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ٥ ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ وَ مَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ وَ مَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ٥ اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ

يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهًا فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ o﴾ [آل عمران: ۳۹ تا ۴۵]

''فرشتوں نے آواز دی جب کہ وہ محراب میں کھڑا نماز پڑھ رہا تھا، کہ ''اللہ تجھے یحییٰ علیہ السلام کی خوش خبری دیتا ہے۔ وہ اللہ کی طرف سے ایک فرمان (یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام) کی تصدیق کرنے والا بن کر آئے گا۔ اس میں سرداری و بزرگی کی شان ہوگی۔ کمال درجے کا ضابطہ ہوگا۔ نبوت سے سرفراز ہوگا اور صالحین میں شمار کیا جائے گا۔'' زکریا علیہ السلام نے کہا ''پروردگار! بھلا میرے ہاں لڑکا کہاں سے ہوگا؟ میں تو بہت بوڑھا ہو چکا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے۔'' جواب ملا: ''ایسا ہی ہوگا، اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔'' عرض کیا ''مالک، پھر کوئی نشانی میرے لیے مقرر فرما دے۔'' کہا ''نشانی یہ ہے کہ تم تین دن تک لوگوں سے اشارہ کے سوا کوئی بات چیت نہ کرو گے (یا نہ کر سکو گے)۔ اس دوران میں اپنے رب کو بہت یاد کرنا اور صبح شام اس کی تسبیح کرتے رہنا۔''

پھر وہ وقت آیا جب مریم علیہا السلام سے فرشتوں نے آکر کہا ''اے مریم! اللہ نے تجھے برگزیدہ کیا اور پاکیزگی عطا کی اور تمام دنیا کی عورتوں پر تجھ کو ترجیح دے کر اپنی خدمت کے لیے چن لیا۔ اے مریمؑ! اپنے رب کی تابع فرمان بن کر رہ۔ اس کے آگے سر بسجود ہو، اور جو بندے اس کے حضور جھکنے والے ہیں ان کے ساتھ تو بھی جھک جا۔''

اے نبیؐ! یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم تم کو وحی کے ذریعہ سے بتا رہے ہیں، ورنہ تم اس وقت وہاں موجود نہ تھے جب ہیکل کے خادم یہ فیصلہ کرنے کے لیے کہ مریمؑ کا سرپرست کون ہو؟ اپنے اپنے قلم پھینک رہے تھے، اور نہ تم اس وقت حاضر تھے جب ان کے درمیان جھگڑا برپا تھا۔

اور جب فرشتوں نے کہا: ''اے مریمؑ! اللہ تجھے اپنے ایک فرمان کی خوش خبری

دیتا ہے۔ اس کا نام مسیح عیسیٰ علیہ السلام ابن مریم ہو گا۔ دنیا اور آخرت میں معزز ہو گا۔ اللہ کے مقرب بندوں میں شمار کیا جائے گا، لوگوں سے گھوارے میں بھی کلام کرے گا اور بڑی عمر کو پہنچ کر بھی، اور وہ ایک مردِ صالح ہو گا۔''

چوتھی پیش گوئی یہ کہ مسیح علیہ السلام سے معجزات کا صدور ہو گا۔ ہم انجیل میں پڑھتے ہیں کہ مسیح علیہ السلام کی پیش گوئی میں کہا گیا ہے کہ مسیح علیہ السلام سے بہت سے معجزات صادر ہوں گے۔ وہ اندھوں، بہروں اور گونگے لوگوں کو ٹھیک کر دے گا۔

ہم انجیل اور قرآن دونوں میں دیکھتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کس قدر معجزات کا صدور ہوا۔ بعض اوقات ان کے پاس آنے والے بھی لوگ شفایاب ہو جاتے تھے۔

بہت سے مسلمانوں کا خیال ہے کہ انبیائے کرام کی کل تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان ۱۲۴۰۰۰ انبیاءؑ میں سے واحد پیغمبر تھے، جن پر یہ پیش گوئی صادق آتی ہے۔

پانچویں پیش گوئی یہ کہ ان کے بھائی ان کی مخالفت کریں گے۔ اس پیش گوئی کے پورا ہونے کے امکانات کتنے تھے؟ چوں کہ بہت سے رہنماؤں کے رشتہ داران کی مخالفت کرتے ہیں، لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ پانچ میں سے ایک امکان تھا۔

چھٹی پیش گوئی جو کہ حضرت زکریا علیہ السلام نے ۵۲۰ ق م میں کی، اور وہ یہ کہ مسیح گدھے پر سوار ہو کر یروشلم میں داخل ہو گا۔ کتنے حکمران ہیں جو گدھے پر سوار ہو کر یروشلم میں داخل ہوں گے۔ آج کل تو ظاہر ہے لوگ مرسڈیز کاروں میں ہوتے ہیں، اس وقت بھی میرے خیال میں سو میں ایک چانس تھا۔

ساتویں پیش گوئی ہیکل کی تباہی سے متعلق ہے جو کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے خود کی تھی۔ ۳۰ء میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے پیش گوئی کی اور چالیس سال بعد یہ پیش گوئی پوری ہوئی، جب رومی جرنیل ٹائی ٹس نے طویل محاصرے کے بعد یروشلم پر قبضہ کیا۔

اس پیش گوئی کے پورا ہونے کا امکان پانچ میں سے ایک تھا۔ کیوں کہ یہودیوں کی بغاوت اور پھر ان کا کچلا جانا کچھ ایسا غیر متوقع نہیں تھا۔

آٹھویں پیش گوئی یہ کہ مسیح کو مصلوب کیا جائے گا۔

کتنے لوگ مصلوب ہوئے ہیں؟ ہم یہ فرض کر لیتے ہیں کہ اس پیش گوئی کے پورے ہونے کا امکان دس ہزار میں سے ایک تھا۔

نویں پیش گوئی یہ کہ لوگ اس کے کپڑے آپس میں تقسیم کر لیں گے۔ اس پیش گوئی کے پورا ہونے کا امکان، میرے خیال میں، سو میں سے ایک تھا۔

بے گناہ ہونے کے باوجود وہ اپنی موت کے لحاظ سے، گناہ گاروں اور امیر لوگوں کے ساتھ شامل کر دیا جائے گا۔ ہم جانتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ڈاکوؤں کے ساتھ مصلوب کیا گیا تھا۔ اس پیش گوئی کے پورا ہونے کا امکان ہزار میں سے ایک تھا۔

آخری پیش گوئی یہ کہ مصلوب ہونے کے بعد وہ دوبارہ جی اُٹھے گا۔ اس پیش گوئی کے ساتھ تو ظاہر ہے کہ کوئی بھی قدر وابستہ کی ہی نہیں جا سکتی۔

اب ہم ذرا ان تمام پیش گوئیوں کے پورا ہونے کے امکانات کا حساب لگاتے ہیں...... یہ امکان ۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰،۰،۲۸ میں سے ایک ہے۔

ایک آسان مثال یہ ہے کہ فرض کر لیجیے پوری ریاست ٹیکساس میں ایک ایک ڈالر کے سکوں کی ایک میٹر اونچی تہہ بچھا دی جائے اور پھر آپ کو اس میں سے ایک نشان زدہ سکہ ڈھونڈنے کو کہا جائے تو جس قدر امکان آپ کے وہ سکہ ڈھونڈ لینے کا ہے، اسی قدر امکان ان پیش گوئیوں کے پورا ہونے کا ہے۔ یعنی دوسرے لفظوں میں کوئی امکان نہیں ہے۔

ایسی بہت سی دیگر پیش گوئیاں بھی ہیں اور یہ ثبوت ہیں اس بات کا کہ انجیل برحق ہے اور یہوواہ الوہیم کی جانب سے نازل شدہ ہے۔

انجیل ہمیں بتاتی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہمارے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لیے تشریف لائے تھے۔ یہ ایک اچھی خبر ہے جب کہ قرآن ہمیں بُری خبر سناتا ہے، سورہ نحل میں تحریر ہے:

﴿وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَّا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا

يَسْتَقْدِمُوْنَ ۝﴾ [النحل: ٦١]

''اگر کہیں اللہ لوگوں کو ان کی زیادتی پر فوراً ہی پکڑ لیا کرتا تو روئے زمین پر کسی متنفس کو نہ چھوڑتا۔ لیکن وہ سب کو ایک وقت مقرر تک مہلت دیتا ہے پھر جب وہ وقت آ جاتا ہے تو اس سے کوئی ایک گھڑی بھر بھی آگے پیچھے نہیں ہو سکتا۔''

مسئلہ یہ ہے کہ وہ لوگ جو اپنی پوری کوشش کر لیں، ان کے بارے میں بھی قرآن محض ایک امکان ہی پیش کرتا ہے، یعنی ''شاید۔''

مثلاً سورۂ قصص میں کہا گیا:

﴿فَاَمَّا مَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَعَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ مِنَ الْمُفْلِحِيْنَ ۝﴾ [القصص: ٦٧]

''البتہ جس نے آج توبہ کر لی اور ایمان لے آیا اور نیک عمل کیے، وہی یہ توقع کر سکتا ہے کہ وہاں فلاح پانے والوں میں سے ہوگا۔''

یعنی وہ بھی یقین نہ رکھے، بلکہ محض توقع ہی رکھ سکتا ہے۔ اسی طرح سورۂ تحریم میں کہا گیا ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيُدْخِلَكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ﴾

[التحریم: ٨]

''اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اللہ سے توبہ کرو، خالص توبہ، بعید نہیں کہ اللہ تمہاری برائیاں دُور کر دے اور تمہیں ایسی جنتوں میں داخل فرما دے جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔''

سورۂ توبہ میں تحریر ہے:

﴿اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ اَقَامَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَى الزَّكٰوةَ وَ لَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰٓى اُولٰٓئِكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ۝﴾ [التوبہ: ١٨]

''اللہ کی مسجدوں کے آباد کار (مجاور و خادم) تو وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو اللہ اور روزِ آخر کو مانیں اور نماز قایم کریں، زکوٰۃ دیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈریں۔ انھی سے یہ توقع ہے کہ سیدھی راہ چلیں گے۔''

یعنی بالآخر تنہائی ہے۔ اگر ایک شخص ایمان نہیں لاتا تو وہ یقینی طور پر جہنم میں جائے گا۔ لیکن اگر وہ ایمان لے بھی آتا ہے تو روزِ حشر وہ یک و تنہا خدا کے سامنے کھڑا ہوگا۔ نہ کوئی دوست ہوگا نہ سفارشی۔ اور محض توقع ہی کر سکتا ہے، امید ہی رکھ سکتا ہے کہ شاید وہ بخشے جانے والوں میں شامل ہو جائے۔ اور یہ بڑی سخت خبر ہے۔ مندرجہ بالا آیات میں لفظ ''عسیٰ'' استعمال ہوا ہے۔ جس کا مطلب ہے ''شاید، ہو سکتا ہے، امکان ہے'' وغیرہ۔

دوسری طرف انجیل میں ہمیں اچھی خبر ملتی ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں:

''میں خدمت کروانے کے لیے نہیں بلکہ خدمت کرنے کے لیے آیا ہوں تاکہ اپنی زندگی، بہت سی زندگیوں کے کفارے میں دے سکوں۔''

اسی طرح بائبل میں مزید کہا گیا ہے:

''اگر تم حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لاؤ اور دل سے یہ یقین رکھو کہ خدا نے انھیں زندہ کر دیا تھا تو تمہاری نجات یقینی ہے۔''

یہ ایک حیرت انگیز طور پر خوش کن خبر ہے۔ آپ پوری ہونے والی پیش گوئیوں کو ثبوت کے طور پر پڑھیں۔ ۵۰۰ لوگوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مصلوب ہونے کے بعد، زندہ دیکھا تھا۔ بہت سے آثارِ قدیمہ بھی ایسے دریافت ہوئے ہیں جو بائبل کی تائید کرتے ہیں۔

میں آپ سب کو یہ دعوت دیتا ہوں کہ آپ بائبل کا مطالعہ کریں۔ آپ کو اپنی روح کے لیے بہت سی خوش خبریاں ملیں گی۔ خدا آپ پر رحم کرے۔

بہت بہت شکریہ

جوابی خطاب

ڈاکٹر ذاکر نائیک

محترم ڈاکٹر ولیم کیمپبل صاحب، سٹیج پر تشریف فرما دیگر معززین، میرے بزرگو، بھائیو اور بہنو! میں آپ سب کو دوبارہ اسلامی طریقے سے خوش آمدید کہتا ہوں:

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ڈاکٹر ولیم کیمپبل نے میرے بیان کردہ بائیس نکات میں سے صرف دو نکات کو چھیڑا ہے۔ جی ہاں، صرف دو نکات کو۔

پہلا نکتہ جس کا انھوں نے جواب دینے کی کوشش کی وہ یہ تھا کہ بائبل میں کائنات کی تشکیل چھ دنوں میں ہونے کا بتایا گیا ہے، ان دنوں سے کیا مراد ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ ان دنوں سے مراد طویل زمانے ہیں۔ اس بات کا جواب میں اپنی گفتگو میں پہلے ہی دے چکا ہوں کہ اگر آپ ''دن'' سے مراد ایک طویل زمانہ لیتے ہیں تو آپ چھ میں سے صرف دو مسائل حل کرتے ہیں، باقی چار مسائل حل طلب ہی رہ جاتے ہیں۔ آفرینش کائنات کے حوالے سے وہ ان مسائل کو تسلیم کرتے ہیں، یہ اچھی بات ہے۔

دوسرا نکتہ جس کا انھوں نے ذکر کیا، وہ مرقس کی انجیل میں بتائے گئے امتحان کے بارے میں تھا۔ اس حوالے سے انھوں نے بتایا کہ ان کے ایک دوست نے جس کا نام ہیری تھا یا جو کچھ بھی اس کا نام تھا، مراکش میں اس نے زہر کھایا اور اس پر اثر نہیں ہوا۔ لیکن انجیل تو کہتی ہے کہ:

''اور اگر کچھ ہلاک کرنے والی چیز پییں گے تو انھیں کچھ ضرر نہ پہنچے گا۔''

[مرقس، باب ۱۶: ۱۸]

یہاں واضح طور پر پینے کا ذکر ہے، کھانے کا نہیں۔ لیکن پھر بھی میں ان کی بات مانے لیتا ہوں کہ کھانے یا پینے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر کوئی زہر پینے کی بجائے کھالے تو بھی وہ اس امتحان میں پورا اُترے گا۔ لیکن ذرا تصور کیجیے ایک شخص، وہ بھی مراکش میں، وہ بھی فوت ہو چکا ہے، مجھے تو بتایا گیا ہے کہ دنیا میں دو ارب مسیحی ہیں۔ ان دو ارب لوگوں میں سے کوئی بھی آگے نہیں آئے گا؟

اور میرا تو خیال تھا کہ ڈاکٹر ولیم کیمپبل خود ایک صاحب ایمان مسیحی ہیں، وہ خود یہ امتحان دینے کے لیے آگے بڑھیں گے، نہ کہ ان کا دوست جو پہلے ہی فوت ہو چکا ہے۔

دوسری بات یہ تھی کہ وہ نئی نئی زبانیں بولیں گے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا اس وقت وہ لوگ یہ زبانیں بولتے تھے۔ یہ امتحان دینا ذرا بھی مشکل نہیں تھا۔ آخر آپ کو ان چند زبانوں میں ایک ایک جملہ ہی بولنا تھا۔ ان زبانوں کو سمجھنے والے یہاں موجود ہوں گے۔

لیکن بات یہ ہے کہ میں اپنی زندگی میں ہزاروں مسیحیوں سے مل چکا ہوں اور ان میں سے کوئی ایک بھی اس امتحان میں پورا نہیں اُترا۔ اگر آج تک اس امتحان میں ناکام رہنے والوں کی تعداد ایک ہزار تھی تو آج ایک ہزار ایک ہوگئی ہے، کیوں کہ ڈاکٹر ولیم کیمپبل سے بھی ملاقات ہوگئی ہے۔

میرے بیان کردہ بائیس نکات میں سے ڈاکٹر ولیم نے انھی دو نکات کو چھیڑا اور باقی ماندہ بیس نکات کا ذکر ہی نہیں کیا۔ اس کی بجائے انھوں نے پیش گوئیوں کی بحث شروع کر دی۔ پیش گوئیوں کا زیر بحث موضوع، یعنی ''بائبل اور جدید سائنس'' سے کیا تعلق ہے؟

اگر پیش گوئیاں ہی معیار ہیں تو پھر ناسٹراڈیمس کی کتاب بہترین کتاب ہے۔ اس بنیاد پر تو اسے کلامِ خداوندی تسلیم کر لیا جانا چاہیے۔ ڈاکٹر ولیم نے Theory of Probability کا ذکر کیا اور اس کا اطلاق بائبل کی پیش گوئیوں پر کیا۔ اگر آپ اس تھیوری کا درست اطلاق دیکھنا چاہتے ہیں تو میری کتاب ''قرآن اور سائنس'' [1] کا مطالعہ کیجیے۔

---

[1] ناشر دارالنوادر، اُردو بازار، لاہور

اگر میں چاہوں تو انجیل کی انہی پیش گوئیوں کو غلط بھی ثابت کر سکتا ہوں لیکن میں ایسا نہیں کروں گا۔ میں تسلیم کر لیتا ہوں کہ جتنی پیش گوئیوں کا ذکر انہوں نے کیا وہ سب مکمل طور پر درست ہیں لیکن ان کے طرزِ استدلال سے یہ بھی نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر انجیل کی ایک بھی پیش گوئی غلط ثابت ہو جائے تو اس کا مطلب ہو گا کہ یہ کتاب منزل من اللہ نہیں ہے۔ اور میں ایسی پیش گوئیوں کی پوری فہرست آپ کے سامنے پیش کر سکتا ہوں۔

مثال کے طور پر کتاب پیدائش کے چوتھے باب کی بارھویں آیت میں قائن سے کہا گیا کہ:

''جب تو زمین کو جوتے گا تو وہ اب تجھے اپنی پیداوار نہ دے گی اور زمین پر تو خانہ خراب اور آوارہ ہو گا۔''

لیکن چند ہی سطروں کے بعد آیت نمبر ۱۷ میں پتہ چلتا ہے:

''اور اس نے ایک شہر بسایا اور اس کا نام اپنے بیٹے کے نام پر حنوک رکھا۔''

یعنی پیش گوئی بالکل غلط ثابت ہوئی۔

اسی طرح یرمیاہ کے باب ۳۶ کی آیت ۳۰ میں ہم پڑھتے ہیں:

''اس لیے شاہ یہوداہ یہویقیم کی بابت خداوند یوں فرماتا ہے کہ اس کی نسل میں سے کوئی باقی نہ رہے گا جو داؤد کے تخت پر بیٹھے اور اس کی لاش پھینکی جائے گی تاکہ دن کو گرمی میں، رات کو پالے میں پڑی رہے۔''

لیکن اگر آپ سلاطین ۔۲ کے چوبیسویں باب کی چھٹی آیت کا مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ:

''اور یہویقیم اپنے باپ دادا کے ساتھ سو گیا اور اس کا بیٹا یہویاکین اس کی جگہ بادشاہ ہوا۔''

یعنی پیش گوئی غلط ثابت ہوئی۔

اگرچہ ایک ہی پیش گوئی کا غلط ہونا یہ ثابت کر دیتا ہے کہ موجودہ انجیل کلامِ خداوندی

نہیں ہے، لیکن میں بہت سی مثالیں پیش کر سکتا ہوں۔

حزقی ایل، باب ۲۶، کی آیت نمبر ۸ میں بتایا گیا ہے کہ بنوکدرضر، شاہ بابل، صور کے شہر کو تباہ کرے گا لیکن ہم سب جانتے ہیں کہ اس شہر کو سکندر اعظم نے تباہ کیا تھا۔ گویا یہ پیش گوئی بھی درست ثابت نہیں ہوئی۔

یسعیاہ، باب نمبر ۷، آیت ۱۴ میں کہا گیا ہے:

''دیکھو، ایک کنواری حاملہ ہوگی اور بیٹا پیدا ہوگا اور وہ اس کا نام عمانوایل رکھے گی۔''

اوّل تو یہاں غلط ترجمہ کیا جا رہا ہے کیوں کہ جو اصل عبرانی لفظ یہاں استعمال ہوا ہے، اس کا مطلب ''کنواری'' نہیں ہوتا بلکہ اس کے معنی ''جوان عورت'' ہیں۔ لیکن مسیحی حضرات کا کہنا ہے کہ یہ بات حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں کی جا رہی ہے۔ لہٰذا ہم ان کی مان لیتے ہیں کہ واقعی یہاں لفظ کنواری استعمال ہوا ہے لیکن یہ آیت کہتی ہے کہ اس کا نام عمانوایل ہوگا اور پوری بائبل میں کسی بھی جگہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو عمانوایل کے نام سے نہیں پکارا گیا۔ لہٰذا بہر صورت یہ پیش گوئی غلط ثابت ہوئی۔

میں بہت سی مثالیں مزید بھی پیش کر سکتا ہوں۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا، ایک ہی مثال یہ ثابت کرنے کے لیے کفایت کرتی ہے کہ بائبل کلامِ خداوندی نہیں ہے۔ میں نے تو بہت سی مثالیں پیش کر دی ہیں۔ لہٰذا آپ کے پیش کردہ نظریے کے مطابق بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ بائبل کلامِ خداوندی نہیں ہے۔

ڈاکٹر ولیم کیمپبل نے میرے اُٹھائے ہوئے نکات کا جواب دینے کے علاوہ بھی چھ سات باتیں کی ہیں جن کا میں ان شاء اللہ اختصار کے ساتھ جواب ضرور دوں گا۔

انھوں نے ایک بات، میرے حوالے سے اور برادر شبیر علی کے حوالے سے یہ کی کہ ہم یہ کہتے ہیں کہ قرآن کے مطابق چاند کی روشنی منعکس روشنی ہوتی ہے۔ جب کہ درحقیقت ایسا نہیں ہے۔

میں دوبارہ عرض کرتا ہوں، سورۂ فرقان میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿تَبٰرَكَ الَّذِيْ جَعَلَ فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِيْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِيْرًا ۝﴾ [الفرقان: ۶۱]

''بڑا متبرک ہے وہ جس نے آسمان میں برج بنائے اور اس میں ایک چراغ اور ایک چمکتا چاند روشن کیا۔''

اس آیت میں سورج کو چراغ قرار دیا گیا ہے۔ اور چاند کے لیے لفظ قمر استعمال ہوا ہے۔ قمر کے ساتھ ہمیشہ منیر کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی منعکس یا مستعار روشنی کے ہیں۔ سورج کے لیے شمس کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور سورج کو ہمیشہ روشن چراغ ہی قرار دیا گیا ہے۔ میں حوالے پیش کر سکتا ہوں۔ مثال کے طور پر:

سورۂ نور، آیات ۱۵ اور ۱۶

سورۂ یونس، آیت ۵

اور اسی طرح متعدد دیگر آیات۔

انھوں نے مزید یہ کہا کہ اگر ''نور'' سے مراد منعکس روشنی ہے تو یہ لفظ سورۂ نور میں خود اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے لیے بھی استعمال ہوا ہے جہاں اللہ تعالیٰ کے بارے میں ارشاد ہے کہ وہی زمین وآسمان کا نور ہے۔

آپ پوری آیت کا مطالعہ کیجیے اور پھر دیکھیے کہ یہاں کیا کہا جا رہا ہے؟

﴿اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ يَهْدِي اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ﴾ [النور: ۳۵]

''اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ (کائنات میں) اس کے نور کی مثال ایسی

ہے جیسے ایک طاق میں چراغ رکھا ہوا ہو، وہ چراغ ایک فانوس میں ہو، فانوس کا حال یہ ہو کہ جیسے موتی کی طرح چمکتا ہوا تارا، اور وہ چراغ زیتون کے ایک ایسے مبارک درخت کے تیل سے روشن کیا جاتا ہو جو نہ شرقی ہو نہ غربی، جس کا تیل آپ ہی آپ بھڑکا پڑتا ہو چاہے آگ اس کو نہ لگے، (اس طرح) روشنی پر روشنی (بڑھنے کے تمام اسباب جمع ہو گئے ہوں) ۔ اللہ اپنے نور کی طرف جس کی چاہتا ہے، رہنمائی فرماتا ہے، وہ لوگوں کو مثالوں سے بات سمجھاتا ہے، وہ ہر چیز سے خوب واقف ہے۔''

اس آیت کے مطالعہ سے واضح طور پر پتہ چلتا ہے کہ اس مثال میں اگر اللہ تعالیٰ نور یعنی منعکس روشنی ہے تو اس روشنی کا منبع یا چراغ بھی وہ خود ہے۔ یعنی اس آیت میں جو مثال پیش کی گئی ہے اس میں روشنی بھی وہ خود ہے اور اس روشنی کا عکس بھی وہ خود۔ فانوس کی مثال دی گئی ہے جس کے اندر روشنی کا ذریعہ بھی ہوتا ہے اور یہ روشنی کو منعکس بھی کرتا ہے۔

ڈاکٹر ولیم نے کہا کہ قرآن بھی نور ہے۔ تو کیا یہ بھی عکس ہے؟ یقیناً قرآن اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی ہدایات کی روشنی اور عکس ہے۔

مزید برآں انھوں نے حضرت محمد ﷺ کے سراج ہونے کا ذکر کیا۔ یقیناً وہ سراج ہیں جن کی روشنی کا عکس احادیث کی صورت میں ہم تک پہنچ رہا ہے۔ اور چونکہ وہ احکامات الٰہیہ ہم تک پہنچانے کا سبب ہیں لہٰذا اس لحاظ سے وہ نور بھی ہیں۔

لہٰذا آپ کسی بھی لحاظ سے دیکھیں، نور یا منیر کا مطلب منعکس، منعطف یا مستعار روشنی ہی بنتا ہے۔

دوسری بات ڈاکٹر ولیم نے سورۂ کہف کی آیت ۸۶ کے حوالے سے کی کہ ذوالقرنین نے سورج کو گدلے پانی میں ڈوبتا دیکھا۔ سورج کا گدلے پانی میں ڈوب جانا یقیناً غیر سائنسی بات ہے۔ لیکن یہاں عربی لفظ وَجَدَ استعمال ہوا ہے جس کا مطلب ہے نظر آنا۔ سو اللہ سبحانہ وتعالیٰ یہاں فرما رہے ہیں کہ ذوالقرنین کو ایسا نظر آیا۔

اگر میں کہوں کہ دوسری جماعت کے ایک بچے نے کہا کہ دو اور دو پانچ ہوتے ہیں تو کیا آپ یہ کہیں گے کہ ''ذاکر کہتا ہے کہ دو اور دو پانچ ہوتے ہیں۔'' یہ میں نہیں کہہ رہا بلکہ آپ کو بتا رہا ہوں کہ بچہ کیا کہہ رہا ہے۔ میں غلط نہیں کہہ رہا بلکہ وہ بچہ غلط کہہ رہا ہے۔

اس آیت کو سمجھنے کے متعدد طریقے ہیں۔ ایک تو یہی کہ وَجَدَ کے معانی پر غور کیا جائے، جو کہ ہیں ''نظر آیا'' اور محمد اسد کے بقول دوسرا طریقہ یہ کہ لفظ مغرب کے معانی پر غور کیا جائے۔ عربی کے لفظ مغرب کے دو معانی ہیں۔ ایک تو سمت کے لیے استعمال ہوتا ہے یعنی مغرب کی سمت (West) اور دوسرے وقت کے لیے یعنی غروب آفتاب کا وقت۔

لہٰذا اگر زیرِ نظر آیت میں غروب آفتاب کے مقام کی بجائے غروب آفتاب کا وقت مراد لیا جائے مسئلہ ہی حل ہو جاتا ہے۔ متعدد طریقوں سے اس آیت کو سمجھا جا سکتا ہے۔ لیکن ہوسکتا ہے کہ ڈاکٹر ولیم اس پر اعتراض کریں اور کہیں کہ ہم باتیں فرض کر رہے ہیں اور ہمیں الفاظ کو ان کے ظاہری معانی میں ہی قبول کرنا چاہیے۔ چلیے اس نہج پر تجزیے کو آگے بڑھاتے ہیں۔ جب ہم روزمرہ گفتگو میں سورج کے نکلنے اور غروب ہونے کا ذکر کرتے ہیں تو کیا ہم واقعی سورج کے نکلنے اور ڈوبنے کا ذکر کر رہے ہوتے ہیں؟ اخبارات میں ہم سورج کے نکلنے اور ڈوبنے کے اوقات دیکھتے ہیں تو کیا اخبارات واقعی سورج کے نکلنے اور ڈوبنے کا ذکر کر رہے ہوتے ہیں؟ سائنسی طور پر ہم سب جانتے ہیں کہ سورج نہ تو نکلتا ہے اور نہ ڈوبتا ہے، دراصل یہ زمین کی گردش ہوتی ہے جس کے سبب ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے تو کیا یہ اخبارات غلط بیانی کر رہے ہوتے ہیں؟

جب میں لفظ Disaster استعمال کرتا ہوں تو میری مراد ایک بڑا حادثہ ہوتی ہے، یہ لفظ انھی معانی میں استعمال ہوتا ہے لیکن اس کے لغوی معانی ''ایک منحوس ستارے'' کے ہوتے ہیں تو کیا جب یہ لفظ استعمال کیا جائے تو ہمیں اس کے لغوی معانی ہی مراد لینے چاہئیں؟

میں اور ڈاکٹر ولیم دونوں بعض اوقات پاگل شخص کے لیے ایک لفظ استعمال کرتے ہیں

Lunatic ،اس لفظ کے لغوی معانی ہوتے ہیں ''Struck by the Moon'' تو کیا ہم اس لفظ کو اس کے لغوی معانی ہی میں استعمال کرتے ہیں؟

لیکن بات یہ ہے کہ زبان کا ارتقا اسی طرح ہوا ہے۔ سورج کے نکلنے اور ڈوبنے کو بھی اسی طرح دیکھنا اور سمجھنا چاہیے۔ اس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سورۂ کہف کی اس آیت میں سورج کے ڈوبنے سے کیا مراد ہے؟ یہاں کوئی بات سائنس کے خلاف نہیں ہے۔

انھوں نے سورۂ فرقان کا بھی حوالہ دیا ہے:

﴿اَلَمْ تَرَ اِلٰی رَبِّکَ کَیْفَ مَدَّ الظِّلَّ وَلَوْ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَیْهِ دَلِیْلًا﴾ [الفرقان: ٤٥]

''تم نے دیکھا نہیں کہ تمہارا رب کس طرح سایہ پھیلا دیتا ہے؟ اگر وہ چاہتا تو اسے دائمی سایہ بنا دیتا۔ ہم نے سورج کو اس پر دلیل بنایا۔''

ڈاکٹر ولیم اپنی کتاب میں اس آیت کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ''سورج کہاں حرکت کرتا ہے؟'' لیکن آپ دیکھ سکتے ہیں کہ اس آیت میں کہیں بھی سورج کی حرکت کا ذکر ہی نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب اپنی گفتگو میں بھی اور اپنی کتاب میں بھی یہی سوال اُٹھاتے ہیں کہ سورج حرکت نہیں کرتا لیکن اس آیت مبارکہ میں تو صرف اتنا ہی کہا گیا ہے کہ سورج کو سائے کی حرکت پر دلیل بنایا گیا ہے۔ اور یہ بات تو وہ شخص بھی جانتا ہے جس نے کبھی مدرسے کا منہ بھی نہیں دیکھا، کہ سائے کا سبب سورج کی روشنی ہوتی ہے۔ لہٰذا قرآن کی بات بالکل درست ہے۔ کیوں کہ قرآن یہ نہیں کہہ رہا کہ سورج کی حرکت کی وجہ سے سایہ گھٹتا بڑھتا ہے۔ یہ بات ڈاکٹر صاحب خود قرآن سے وابستہ کر رہے ہیں۔ سورج سائے پر دلیل ہے کیوں کہ سورج کی روشنی کی وجہ سے ہی سایہ گھٹتا بڑھتا ہے۔ اگر روشنی نہ ہو تو سایہ بھی نہیں ہو گا۔ سایہ تو ظاہر ہے دیگر روشنی کے ذرائع کی وجہ سے بھی بن سکتا ہے لیکن یہاں خاص سائے کی بات ہو رہی ہے جو گھٹتا بھی ہے اور بڑھتا بھی ہے اور یہ سایہ سورج کی وجہ سے ہوتا ہے۔

ڈاکٹر کیمپبل نے سلیمانؑ کی وفات کا بھی ذکر کیا ہے۔ انھوں نے سورۂ سبا کی آیت کا حوالہ دیا ہے:

﴿فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلَىٰ مَوْتِهِ إِلَّا دَابَّةُ الْأَرْضِ تَأْكُلُ مِنسَأَتَهُ فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ أَن لَّوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوا فِي الْعَذَابِ الْمُهِينِ ۝﴾ [سبا: ١٤]

''پھر جب سلیمانؑ پر ہم نے موت کا فیصلہ نافذ کیا تو جنوں کو اس کی موت کا پتہ دینے والی کوئی چیز اس گھن کے سوا نہ تھی جو اس کے عصا کو کھا رہا تھا، اس طرح جب سلیمان گر پڑا تو جنوں پر یہ بات کھل گئی کہ اگر وہ غیب کے جاننے والے ہوتے تو اس ذلت کے عذاب میں مبتلا نہ رہتے۔''

اس آیت کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایک شخص چھڑی کے سہارے کھڑا ہو، وہ فوت ہو جائے اور کسی کو پتہ ہی نہ چلا۔

اس آیت کریمہ کی وضاحت بھی متعدد طریقوں سے ممکن ہے۔ پہلی بات تو یہی ہے کہ حضرت سلیمانؑ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر تھے اور یہ ان کا ایک معجزہ ہو سکتا ہے۔ جب بائبل یہ کہتی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مردوں کو زندہ کر دیا کرتے تھے اور یہ کہ وہ بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے تو یہ بات حضرت سلیمان علیہ السلام کے واقعے کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ ناقابل یقین ہوتی ہے۔ آپ خود بتایئے کسی مردے کا زندہ کر دینا اور بغیر باپ کے پیدا ہونا زیادہ حیرت انگیز ہے یا کسی مردہ شخص کا چھڑی کے سہارے کھڑے رہنا؟

سو اگر اللہ سبحانہ و تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ذریعے معجزات ظاہر فرما سکتا ہے تو حضرت سلیمان علیہ السلام کے ذریعے کیوں نہیں فرما سکتا؟

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے سمندر میں راستہ بن سکتا ہے، ان کا عصا اژدھے میں تبدیل ہو سکتا ہے، بائبل یہ بتاتی ہے، قرآن بھی یہی بتاتا ہے، سو اگر اللہ تعالیٰ کے لیے یہ ممکن ہے تو حضرت سلیمان علیہ السلام والا واقعہ کیوں ممکن نہیں ہے؟

متعدد دیگر تاویلات بھی ممکن ہیں کیوں کہ قرآن یہ تو کہہ ہی نہیں رہا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام ''بہت طویل عرصے'' تک چھڑی کے سہارے کھڑے رہے تھے...... سورۂ نسا میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَ لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِیْهِ اخْتِلَافًا كَثِیْرًا﴾ [النساء: ۸۲]

''کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے؟ اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت کچھ اختلاف بیانی پائی جاتی۔''

آپ کسی بھی نقطہ نظر سے قرآن کا مطالعہ کریں۔ اگر آپ کا طریقہ کار منطقی ہے تو آپ قرآن میں کہیں بھی تضاد اور اختلاف نہیں پائیں گے، اور نہ ہی قرآن کی کوئی آیت مصدقہ سائنسی حقایق کے خلاف ہوگی۔

میں ڈاکٹر ولیم کیمپبل سے اتفاق کرتا ہوں، حضرت سلیمان علیہ السلام طویل عرصہ تک کھڑے رہے ہوں گے اور اس کی وجہ بھی اسی جگہ بیان کر دی گئی ہے۔ جب حضرت سلیمان علیہ السلام گرے ہیں اور جنوں کو ان کی وفات کا علم ہوا تو انھوں نے کہا کہ اگر ہمیں غیب کا علم ہوتا تو ہم اتنا عرصہ مشقت نہ کرتے۔ دراصل ان جنات کو اپنی طاقت کا بہت زعم تھا، جسے ختم کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان پر واضح فرمایا کہ انھیں علم غیب حاصل نہیں ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے دودھ بننے کے عمل کا بھی ذکر کیا ہے۔ سورۂ النحل کی آیت کے حوالے سے انھوں نے اعتراض کیا ہے۔

سب سے پہلا شخص جس نے دورانِ خون کا عمل دریافت کیا وہ ابن نفیس تھا۔ اس نے یہ دریافت نزولِ قرآن کے چھ سو سال بعد کی تھی اور ابن نفیس کے بھی چار سو سال بعد ولیم ہاروی کے ذریعے یہ بات اہل مغرب کے علم میں آئی۔ یعنی نزولِ قرآن کے ایک ہزار سال بعد۔

جو غذا ہم کھاتے ہیں وہ معدے اور آنتوں میں ہضم ہوتی ہے۔ ہضم کے بعد خوراک

کے اجزا دورانِ خون کے ذریعے جسم کے مختلف اعضا تک پہنچتے ہیں۔ جگر کا فعل بھی اس عمل میں اپنا کردار ادا کرتا ہے۔ دورانِ خون کے اس عمل کے ذریعے ہی غذائی اجزا دودھ پیدا کرنے والے غدودوں تک بھی پہنچتے ہیں۔

جدید سائنس کی فراہم کردہ یہ تمام معلومات اجمال واختصار کے ساتھ اس آیت قرآنی میں بیان کردی گئی ہیں:

﴿وَ اِنَّ لَکُمْ فِی الْاَنْعَامِ لَعِبْرَۃً نُسْقِیْکُمْ مِّمَّا فِیْ بُطُوْنِہٖ مِنْۢ بَیْنِ فَرْثٍ وَّ دَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِیْنَ۝﴾ [النحل: ٦٦]

''اور تمہارے لیے مویشیوں میں بھی ایک سبق موجود ہے۔ ان کے پیٹ سے گوبر اور خون کے درمیان ہم ایک چیز تمہیں پلاتے ہیں، یعنی خالص دودھ جو پینے والوں کے لیے نہایت خوش گوار ہے۔''

حمد وثنا اللہ کے لیے ہے جس نے ہمیں قرآن کے ذریعے چودہ سو سال پہلے ہی ان حقایق کا علم دیا، جن کے بارے میں جدید سائنس آج انکشافات کر رہی ہے۔ سورۂ مومنون میں بھی ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَاِنَّ لَکُمْ فِی الْاَنْعَامِ لَعِبْرَۃً نُسْقِیْکُمْ مِّمَّا فِیْ بُطُوْنِھَا وَلَکُمْ فِیْھَا مَنَافِعُ کَثِیْرَۃٌ وَّمِنْھَا تَاْکُلُوْنَ۝ وَعَلَیْھَا وَعَلَی الْفُلْکِ تُحْمَلُوْنَ۝﴾

[المؤمنون: ۲۱،۲۲]

''اور حقیقت یہ ہے کہ تمہارے لیے مویشیوں میں بھی ایک سبق ہے۔ ان کے پیٹوں میں جو کچھ ہے، اسی میں سے ایک چیز (یعنی دودھ) ہم تمہیں پلاتے ہیں اور تمہارے لیے ان میں بہت سے دوسرے فایدے بھی ہیں۔ ان کو تم کھاتے ہو اور ان پر اور کشتیوں پر سوار بھی کیے جاتے ہو۔''

ڈاکٹر ولیم نے حیوانوں کے گروہوں میں رہنے کے حوالے سے بھی ایک نکتہ اُٹھایا ہے۔ متعلقہ آیت کریمہ قرآن مجید کی سورۂ انعام میں ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ وَ لَا طٰٓئِرٍ یَّطِیْرُ بِجَنَاحَیْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُکُمْ مَا فَرَّطْنَا فِی الْکِتٰبِ مِنْ شَیْءٍ ثُمَّ اِلٰی رَبِّهِمْ یُحْشَرُوْنَ﴾

[الانعام: ۳۸]

''زمین میں چلنے والے کسی جانور اور ہوا میں پروں سے اُڑنے والے کسی پرندے کو دیکھ لو، یہ سب تمہاری ہی طرح کی انواع ہیں، ہم نے ان کی تقدیر کے نوشتے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ پھر یہ سب اپنے رب کی طرف سمیٹے جاتے ہیں۔''

قرآن مجید تو یہ کہہ رہا ہے اور ڈاکٹر ولیم کہہ رہے ہیں کہ مکڑی اپنے نر کو ہلاک کر دیتی ہے اور شیر یوں کرتا ہے اور ہاتھی یوں کرتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

وہ رویوں کے بارے میں بات کر رہے ہیں، قرآن رویے کی بات ہی نہیں کر رہا۔ اگر ڈاکٹر ولیم کیمپبل قرآن کی بات نہیں سمجھ پائے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ قرآن کی بات غلط ہے۔

قرآن یہ کہہ رہا ہے کہ یہ انواع ہیں تمہاری طرح۔ یعنی جانوروں اور پرندوں کے بھی انسانوں کی طرح گروہ ہوتے ہیں۔ قرآن ان کے رویوں کی بات نہیں کر رہا۔

اور آج جدید سائنس بھی ہمیں یہی بتاتی ہے کہ جانور اور پرندے بھی ہماری طرح گروہوں کی صورت میں ہی رہتے ہیں۔

میں علم الجنین کے حوالے سے تفصیلی گفتگو نہیں کر سکا تھا کیوں کہ وقت محدود تھا۔ ڈاکٹر ولیم کے اُٹھائے ہوئے تمام نکات کا جواب میں نے دے دیا ہے۔ اب ہم علم الجنین کے حوالے سے ذرا تفصیل سے بات کریں گے۔ جن نکات کا جواب میں دے چکا ہوں ان کے علاوہ ڈاکٹر ولیم نے کچھ باتیں کی ہیں۔ ایک بات انھوں نے یہ کی کہ جنین کی نشو و نما کے مراحل کا ذکر Hippocritus اور گالن وغیرہ نے بھی کیا ہے۔ یہاں ایک بنیادی نکتہ سمجھ لینا ضروری ہے۔ اگر کسی نے کوئی ایسی بات کی ہے جس سے قرآن کو اتفاق ہے تو اس سے

یہ مراد لینا ہرگز درست نہ ہوگا کہ وہ بات قرآن نے اس شخص سے اخذ کی ہوگی۔ مثال کے طور پر میں ایک بیان دیتا ہوں اور فرض کیجیے کہ وہ بیان درست ہے۔ اب اگر وہی بیان مجھ سے پہلے بھی کوئی دے چکا ہے تو اس سے یہ ثابت نہیں ہو جاتا کہ میں نے لازماً اس شخص کی نقل کی ہے یا اس سے استفادہ کیا ہے۔ اس کا امکان ضرور ہے لیکن یہ ضروری نہیں ہے۔ لہٰذا ہمیں چاہیے کہ صورتِ حال کا تجزیہ کریں۔

قرآن گالن اور ہپو کریٹس وغیرہ کی ہر بات سے اتفاق نہیں کرتا۔ جنین کے ارتقا کے حوالے سے قرآن اور گالن وغیرہ کے نظریات میں مکمل یکسانیت نہیں پائی جاتی۔ اگر قرآن نے (نعوذ باللہ) ان سائنس دانوں کی نقل کی ہوتی تو دونوں میں مکمل یکسانیت پائی جاتی۔ یہ ایک منطقی بات ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا تھا کہ کچھ چیزوں کی تو نقل کر لی جاتی اور کچھ چیزیں جو غلط ہیں، وہ چھوڑ دی جاتیں۔ گالن اور ہپو کریٹس وغیرہ ''جونک نما مرحلے'' کا ذکر نہیں کرتے۔ ان کے ہاں ''مضغة'' کا تصور پایا ہی نہیں جاتا۔

مزید برآں ان سائنس دانوں نے یہ بھی کہا کہ عورت میں بھی مادۂ منویہ ہوتا ہے۔ اور یہی بات بائبل میں بھی کی گئی ہے۔ لہٰذا گالن اور ہپو کریٹس سے استفادہ دراصل انجیل میں کیا گیا ہے۔

بائبل میں ہم پڑھتے ہیں:

''کیا تو نے مجھے دودھ کی طرح نہیں انڈیلا اور پنیر کی طرح نہیں جمایا؟''

[ایوب۔ باب ۱۰۔۱۰]

یہ دودھ اور جمے ہوئے پنیر کا تذکرہ کیا ہے؟ سیدھی سیدھی گالن کی نقل ہے۔ نقل کیوں؟ کیوں کہ یہ جملہ کلامِ الٰہی نہیں ہے۔ یہ بات غلط ہے۔ دراصل یہ گالن، ہپو کریٹس اور دیگر یونانیوں کا خیال تھا کہ جنین کی تشکیل جمے ہوئے پنیر کی طرح ہوتی ہے۔ اور بائبل میں یہ بات بعینہٖ نقل کر لی گئی ہے۔ قرآن میں ہرگز ایسا نہیں ہے۔

اگر آپ علم الجنین کے حوالے سے لکھی گئی کتابوں کا مطالعہ کریں، مثال کے طور پر

ڈاکٹر کیتھ مور کی کتاب دیکھیں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ گالن، ہپو کریٹس اور ارسطو وغیرہ نے اس موضوع پر بہت زیادہ توجہ نہیں دی۔ اُن کی کچھ باتیں درست ہیں تو بہت سی باتیں غلط بھی ہیں۔

ڈاکٹر مور مزید لکھتے ہیں کہ قرونِ وسطیٰ یا اس وقت کے عربوں کے لحاظ سے قرآن ہمیں اضافی معلومات فراہم کرتا ہے۔ ڈاکٹر کیتھ مور اپنی کتاب میں قرآن کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔ وہ ارسطو اور ہپو کریٹس کا بھی اعتراف کرتے ہیں لیکن یہ بھی بتاتے ہیں کہ ان کی باتیں غلط بھی ہیں۔ قرآن کے کسی بیان کے بارے میں وہ ایسا نہیں کہتے۔ یہی اس بات کا کافی ثبوت ہے کہ قرآن، یونانی نظریات کی نقل نہیں کر رہا۔

رہی بات چاند کی روشنی اور زمین کی گردش کی، تو مجھے فیثا غورث کے بارے میں بھی پتہ ہے اور یہ بھی کہ زمانہ قبل مسیح میں ہی بعض یونانیوں کا خیال تھا کہ زمین گردش میں ہے، چاند کی روشنی دراصل سورج کی روشنی کا عکس ہے۔

لیکن .... اگر رسول اللہ ﷺ (نعوذ باللہ) ان نظریات کی نقل کر رہے ہوتے تو پھر وہ ان کے اس نظریے کو بھی قبول کرتے کہ سورج ساکن ہے اور پوری کائنات کا مرکز ہے۔ یہ کس طرح ممکن ہوا کہ درست باتیں قبول کر لی گئیں اور غلط باتیں چھوڑ دی گئیں۔

ڈاکٹر ولیم کیمپبل ایک طویل فہرست پیش کر دیتے ہیں۔ یونانی زبان سے Cyriac میں ترجمہ ہوا، اس سے عربی میں ہوا، لیکن قرآن کی ایک آیت اس طرزِ استدلال کی نفی کر دینے کے لیے کفایت کرتی ہے۔

سورۂ عنکبوت میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ مَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّ لَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ۝﴾ [العنکبوت: ۴۸]

"(اے نبی ﷺ) تم اس سے پہلے کوئی کتاب نہ پڑھتے تھے، اور نہ اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو باطل پرست لوگ شک میں پڑ سکتے تھے۔"

رسول اللہ ﷺ اُمی تھے وہ پڑھے لکھے نہیں تھے۔ یہ تاریخی حقیقت یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ انھوں نے کہیں سے، کسی سے نقل نہیں کی۔ دیکھیے، تصور کیجیے، ایک سائنس دان، تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود بھی یہ سب کچھ معلوم نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے پھر بھی حکمت کے تحت رسول اللہ ﷺ کو اُمّی رکھا، تا کہ لوگوں کو، متکبر لوگوں کو، اسلام کے خلاف کتابیں لکھنے والے لوگوں کو، منہ کھولنے کا موقع نہ ملے۔

میں بائبل کے حوالے سے بہت سی باتیں کر سکتا ہوں۔ لیکن جہاں تک قرآن کا تعلق ہے میں ڈاکٹر ولیم کی جانب سے اُٹھائے گئے تمام نکات کا جواب دے چکا ہوں، الحمد للہ۔ کوئی ایک نکتہ بھی ایسا نہیں بچا جس سے قرآن کا سائنس کے خلاف ہونا ثابت ہو۔

انھوں نے میرے اُٹھائے ہوئے ۲۲ نکات میں سے صرف دو نکات کو چھیڑا اور انہیں بھی ثابت نہیں کر سکے۔ لہٰذا یہ بائیس کے بائیس نکات ثابت کرتے ہیں کہ بائبل جدید سائنس سے مطابقت نہیں رکھتی۔

اب نکتہ نمبر ۲۳ پیش خدمت ہے۔ یہ نکتہ علم الحیوانات سے متعلق ہے۔

کتاب احبار، باب ۱۱ کی چھٹی آیت دیکھیں:

"اور خرگوش کو کیوں کہ وہ جگالی تو کرتا ہے لیکن اس کے پاؤں الگ نہیں۔ وہ بھی تمہارے لیے ناپاک ہے۔"

یہاں واضح طور پر کہا جا رہا ہے کہ خرگوش جگالی کرتا ہے۔ حالاں کہ آج ہم سب جانتے ہیں کہ خرگوش جگالی نہیں کرتا، اور نہ ہی اس کے معدے کی بناوٹ جگالی کرنے والے جانوروں کی سی ہوتی ہے۔ دراصل اس کے منہ کی مسلسل حرکت کی وجہ سے زمانہ قدیم میں ایسا سمجھا جاتا تھا۔

اسی طرح امثال، باب ۶، آیت ۷ میں کہا گیا کہ چیونٹیوں کا نہ کوئی سردار ہے، نہ ناظر اور نہ حاکم۔ آج ہم جانتے ہیں کہ چیونٹیاں نہایت منظم مخلوق ہیں۔ ان کے ہاں ایک باقاعدہ نظام پایا جاتا ہے جس کے مطابق وہ محنت کرتی اور خوراک جمع کرتی ہیں۔ ان میں

باقاعدہ سردار چیونٹی بھی ہوتی ہے اور نیچے درجہ بدرجہ کارکن چیونٹیاں ہوتی ہیں۔

یہ ایک سائنسی حقیقت ہے جسے بائبل نظر انداز کرتی ہے، لہٰذا بائبل کا بیان غیر سائنسی ہے۔

کتاب پیدائش، باب ۳، آیت ۱۴ اور پھر یسعیاہ، باب ۶۵، آیت ۲۵ میں کہا گیا ہے کہ سانپ کی خوراک خاک ہے۔ حیاتیات کی کوئی کتاب ہمیں یہ نہیں بتاتی کہ سانپ کی خوراک خاک ہے۔

مزید برآں بائبل میں ایسے جانوروں کا ذکر بھی موجود ہے جو سرے سے وجود ہی نہیں رکھتے مثلاً ایک دیو مالائی جانور Unicorn۔ یہ ایک سینگ والا گھوڑا ہے جو صرف اساطیر میں پایا جاتا ہے، حقیقی دنیا میں وجود نہیں رکھتا۔

میرا وقت ختم ہونے والا ہے۔ اگر میری کسی بات سے کسی مسیحی بھائی کے جذبات مجروح ہوئے ہیں تو میں اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ میری نیت کسی کے جذبات مجروح کرنے کی نہیں تھی۔ مجھے تو ڈاکٹر کیمپبل کا جواب دینا ہے اور ان کی کتاب کا رد کر کے یہ ثابت کرنا ہے کہ قرآن اور جدید سائنس میں مکمل مطابقت پائی جاتی ہے۔

اور جہاں تک بائبل کا تعلق ہے، اس کے ایک حصے کے بارے میں تو ہم یہ امکان تسلیم کرتے ہیں کہ یہ کلامِ خداوندی ہو سکتا ہے لیکن مجموعی طور پر، اس کی موجودہ صورت میں ہم بائبل کو منزل من اللہ نہیں سمجھتے۔

اب میں اپنی گفتگو ختم کرتا ہوں۔ میں اپنی بات قرآن کریم کی اس آیت پر ختم کرنا چاہوں گا:

﴿وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا﴾

[بنی اسرائیل: ۸۱]

”اور اعلان کر دو کہ ”حق آ گیا اور باطل مٹ گیا، باطل تو مٹنے ہی والا ہے۔“

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

حصہ دوئم

سوالات و جوابات

www.1Or3.com

خطبات ڈاکٹر ذاکر نائیک



ڈاکٹر ذاکر نائیک

سوال:......میرا سوال ڈاکٹر کیمپبل سے ہے۔ کتاب پیدائش میں کہا گیا ہے کہ طوفان نوح پوری دنیا میں آیا تھا۔ دنیا کی ہر چیز، ہر پہاڑ اس میں ڈوب گیا تھا۔ دوسری طرف یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ پانی پندرہ ہاتھ اونچا تھا۔ ہم جانتے ہیں کہ دنیا کا بلند ترین پہاڑ پندرہ ہاتھ اونچا نہیں تھا۔ پھر اس بات کا کیا مطب ہے؟

ڈاکٹر ولیم کیمپبل:......سوال کے لیے شکریہ۔ میرے خیال میں بائبل یہ کہہ رہی ہے کہ بلند ترین پہاڑ سے بھی پانی پندرہ ہاتھ اونچا تھا۔ یعنی اگر بلند ترین پہاڑ تین ہزار میٹر بلند تھا تو پانی کی بلندی تین ہزار میٹر اور پندرہ ہاتھ تھی۔

اور میرا خیال ہے کہ قرآن بھی طوفانِ نوح کا بیان اسی طریقے سے کرتا ہے:

﴿حَتّٰٓی اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ قُلْنَا احْمِلْ فِیْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَیْنِ اثْنَیْنِ وَ اَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَیْهِ الْقَوْلُ وَ مَنْ اٰمَنَ وَ مَآ اٰمَنَ مَعَهٗٓ اِلَّا قَلِیْلٌ۝﴾ [هود: ٤٠]

''یہاں تک کہ جب ہمارا حکم آ گیا اور وہ تنور اُبل پڑا تو ہم نے کہا کہ ہر قسم کے جانوروں کا ایک ایک جوڑا کشتی میں رکھ لو، اور اپنے گھر والوں کو بھی، سوائے ان اشخاص کے جن کی نشان دہی پہلے کی جا چکی ہے، اس میں سوار کرا دو اور ان لوگوں کو بھی بٹھا لو جو ایمان لائے ہیں اور تھوڑے ہی لوگ تھے جو نوح کے ساتھ ایمان لائے تھے۔''

اس کے بعد قرآن مختلف علاقوں کا ذکر کرتا ہے اور انبیائے کرام کی فہرست دیتا ہے، جس میں نوح سے پہلے کا کوئی نبی شامل نہیں۔ حالاں کہ حضرت آدم علیہ السلام بھی نبی ہو سکتے تھے۔ بہر حال میرے خیال میں قرآن بھی یہی کہتا ہے کہ یہ طوفان پوری دنیا میں آیا تھا۔

سوال:......ڈاکٹر ذاکر صاحب! آپ نے اپنی گفتگو کے دوران میں کہا کہ اللہ نور ہے، میں آپ کی بات سمجھ نہیں سکا۔ وضاحت کر دیجیے۔

ڈاکٹر ذاکر نائیک:...... بھائی نے یہ سوال اس لیے کیا ہے کہ وہ ڈاکٹر ولیم

کے جواب میں میری گفتگو کو سمجھ نہیں پائے جو اللہ اور نور کے حوالے سے تھی۔ قرآن مجید کی سورۂ نور کی پینتیسویں آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ [النور: ۳۵]

''اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔''

نور کا مطلب منعکس یا مستعار روشنی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے پوچھا تھا کہ کیا اللہ تعالیٰ کی روشنی بھی مستعار ہے؟ اس سوال کے جواب میں کہا گیا تھا کہ اگر آپ اس آیت کا مطالعہ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ اس میں فانوس کی مثال دی گئی ہے۔ فانوس میں ایک چراغ ہوتا ہے جو اپنی روشنی رکھتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ اپنی روشنی رکھتا ہے۔ فانوس روشنی منعکس بھی کرتا ہے۔ اس لحاظ سے اس روشنی کو نور کہنا بھی روا ہے۔

آپ یہاں یہ ہیلوجن لیمپ دیکھ رہے ہیں۔ اس کے راڈ کو آپ سراج یا وہاج یا چراغ کہہ سکتے ہیں۔ جب کہ اس کے Reflecter کو منیر کہا جا سکتا ہے۔

لیکن ظاہر ہے کہ اس روشنی سے مراد عام روشنی نہیں ہے بلکہ یہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی روحانی روشنی ہے۔ لیکن ظاہر ہے ڈاکٹر ولیم کیمپبل کو جواب دینے کے لیے جتنی ضرورت تھی میں نے اتنی ہی بات کی۔

البتہ چونکہ میرے پاس جواب کے لیے پانچ منٹ ہیں لہٰذا میں ایک اور بات بھی کرنا چاہوں گا۔ ڈاکٹر ولیم کیمپبل نے حضرت نوحؑ کا ذکر کیا ہے۔ دیکھیے میں بائبل کے حق میں Conflict Approch اور قرآن کے حق میں Concordance Approch استعمال کر رہا ہوں کیوں کہ الحمد للہ کسی بھی صورت میں قرآن برحق ہی ثابت ہوتا ہے۔

اگر میں ڈاکٹر ولیم کی بات مان بھی جاؤں اور یہ بات تسلیم کر بھی لوں کہ طوفانِ نوحؑ کا پانی دنیا کے بلند ترین پہاڑ سے بھی پندرہ ہاتھ بلند تھا تو ایک اور مسئلہ سامنے آتا ہے۔ کتاب پیدائش کے باب نمبر ۷ آیت نمبر ۱۹ اور ۲۰ میں کہا گیا ہے:

''اور پانی زمین پر چڑھتا ہی گیا اور بڑھا اور کشتی پانی کے اوپر تیرتی رہی اور

پانی زمین پر بہت ہی زیادہ چڑھا اور سب اونچے پہاڑ جو دنیا میں ہیں پانی میں چھپ گئے۔''

اگر آپ طوفانِ نوحؑ کے وقت کا تعین انجیل کی مدد سے کریں تو یہ اکیسویں یا بائیسویں صدی قبل مسیح کا دور بنتا ہے۔ یہ وہ دور ہے جب بابل میں تیسرے اور مصر میں گیارھویں خاندان کی حکومت چل رہی تھی۔ لیکن وہاں اس طوفان کا کوئی اثر نہیں ملتا۔ یعنی یہ علاقے طوفان سے بالکل محفوظ رہے۔ پس آثارِ قدیمہ کی شہادت سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ طوفانِ نوحؑ کا عالم گیر ہونا یعنی پوری زمین پر محیط ہونا ممکن ہی نہیں ہے۔

رہا یہ سوال کہ قرآن اس بارے میں کیا کہتا ہے تو پہلی بات تو یہ ہے کہ قرآن تاریخ کا تعین نہیں کرتا۔ قرآن یہ نہیں کہتا کہ سیلاب بائیسویں صدی قبل مسیح میں آیا تھا یا پچاسویں صدی قبل مسیح میں آیا تھا۔

دوسری بات یہ کہ قرآن کہیں یہ نہیں کہتا کہ سیلاب عالم گیر تھا اور ساری زمین اس میں ڈوب گئی تھی۔ قرآن صرف حضرت نوحؑ اور ان کی قوم کا ذکر کرتا ہے جو ایک چھوٹی قوم بھی ہو سکتی ہے اور بڑی بھی۔

آج ماہرین آثارِ قدیمہ یہ امکان تو تسلیم کرتے ہیں کہ دنیا کا ایک مخصوص علاقہ زیرِ آب آ گیا ہو لیکن عالم گیر سیلاب کا نظریہ کوئی بھی تسلیم نہیں کرتا۔ لہٰذا الحمد للہ قرآن تو جدید ترین علوم کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے، لیکن بائبل نہیں۔

مزید برآں اگر آپ کتاب پیدائش کے چھٹے باب کی پندرھویں اور سولھویں آیت کا مطالعہ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ خدا حضرت نوحؑ کو حکم دیتا ہے:

''اور ایسا کرنا کہ کشتی کی لمبائی تین سو ہاتھ، اس کی چوڑائی پچاس ہاتھ اور اس کی اونچائی تیس ہاتھ ہو۔''

اگر آپ حساب لگائیں تو پتہ چلتا ہے کہ کشتی کا کل حجم ڈیڑھ لاکھ مکعب فٹ سے زیادہ نہیں بنتا اور رقبہ بھی تقریباً ۳۳،۷۵۰ مربع فٹ بنتا ہے۔ بائبل کہتی ہے کہ کشتی تین منزلہ تھی

یعنی کل رقبہ تقریباً ایک لاکھ مربع فٹ تھا۔ یہ کل دستیاب جگہ تھی۔ ذرا تصور کیجیے، دنیا کے ہر جاندار کا ایک جوڑا اس ایک لاکھ مربع فٹ میں آنا تھا۔ کیا یہ ممکن ہے؟

دنیا میں لاکھوں اقسام کے جاندار ہیں۔ اگر میں یہ کہوں کہ اس آڈیٹوریم میں ایک لاکھ لوگ آئے تو کیا آپ تسلیم کرلیں گے؟ مجھے یاد ہے، پچھلے سال میں نے کیرالہ میں ایک خطاب کیا تھا۔ وہاں دس لاکھ لوگ آئے تھے۔ وہ میری زندگی کا سب سے بڑا اجتماع تھا۔ تاحد نظر لوگ ہی لوگ تھے۔ میں آخر تک دیکھ بھی نہیں پارہا تھا۔ لیکن وہ ایک ملین لوگ کسی آڈیٹوریم میں نہیں تھے۔ یہ لوگ ساحل سمندر پر جمع ہوئے تھے۔ میں سامنے کے چند لوگوں کے علاوہ باقی لوگوں کو دیکھ بھی نہیں سکتا تھا۔ اگر آپ اس اجتماع کی ویڈیو دیکھیں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ ایک لاکھ لوگ کس قدر ہوتے ہیں۔ اسی طرح عرفات کے اجتماع سے بھی آپ کو اندازہ ہوسکتا ہے جہاں ڈھائی ملین لوگ جمع ہوتے ہیں۔

لہٰذا ایک لاکھ مربع فٹ رقبے میں لاکھوں جانداروں کا رہنا بالکل ناممکن ہے جب کہ انھوں نے اسی جگہ میں چالیس دن رہنا بھی ہو کھانا پینا بھی ہو اور حوائج ضروریہ سے بھی فارغ ہونا ہو۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ بھی بائبل کی سائنسی اغلاط میں سے ہے۔

سوال:...... ڈاکٹر ولیم کیمپبل، آپ بائبل میں دیا گیا امتحان خود کیوں نہیں دیتے تاکہ یہاں موجود حاضرین پر یہ بات ثابت ہوجائے کہ آپ ایک حقیقی مسیحی ہیں؟

ڈاکٹر ولیم کیمپبل:...... مجھے ڈاکٹر ذاکر نائیک کی تاویل سے اتفاق نہیں ہے۔ دیکھیے، خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی بھٹکانے کی کوشش کی گئی تھی۔ شیطان نے ان سے کہا کہ اگر آپ ابن اللہ ہیں تو ہیکل سے نیچے چھلانگ لگا دیں۔ لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ خدا کا امتحان نہیں لینا چاہیے۔ میں بھی خدا کا امتحان لینے کی کوشش نہیں کروں گا۔ میں یہاں آپ کے سامنے معجزہ دکھانے کی کوشش نہیں کروں گا۔ میرے دوست ہیری نے دعوت میں جانے کا وعدہ کیا تھا اور اس نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ لیکن وہ صورتِ حال مختلف تھی۔ میں خدا کی تقدیر پر ایمان رکھتا ہوں۔

سوال:...... مسیحی حضرات عقیدہ تثلیث کی سائنسی تاویل اس طرح کرتے ہیں کہ جس طرح پانی کی تین طبعی صورتیں ٹھوس، مائع اور گیس ہوسکتی ہیں یعنی وہ برف، پانی اور بھاپ کی شکل میں ہوسکتا ہے۔ اسی طرح خدا بھی باپ، بیٹے اور روح القدس کی تثلیث کی صورت میں ہے۔ کیا آپ اس تاویل کو درست سمجھتے ہیں؟

ڈاکٹر ذاکر نائیک:...... آپ کے سوال کا جواب دینے سے پہلے میں ایک وضاحت چاہوں گا۔ یہ بات درست ہے کہ ہمیں خدا کا امتحان لینے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے لیکن یہ کوشش کون کر رہا ہے؟ ہم تو ڈاکٹر ولیم کا امتحان لینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ خدا نے وعدہ کیا ہے کہ صاحب ایمان پر یہ خطرناک زہر اثر نہیں کرے گا اور وہ نئی نئی زبانیں بولیں گے۔ ہم خدا کا امتحان نہیں لے رہے۔ خدا پر ہمارا ایمان ہے کہ وہ ہر صاحب ایمان کو اس امتحان میں کامیاب کرے گا۔ ہم تو آپ کا امتحان لے رہے ہیں کہ آپ صاحب ایمان مسیحی ہیں یا نہیں؟

اب میں بہن کے سوال کی طرف آتا ہوں۔ ان کا سوال یہ ہے کہ مسیحی حضرات عقیدۂ تثلیث کی سائنسی وضاحت اس طرح کرتے ہیں کہ ''جس طرح پانی تین صورتوں یعنی ٹھوس، مائع اور گیس میں پایا جاتا ہے، اسی طرح خدا بھی باپ، بیٹے اور روح القدس کی صورت میں موجود ہے۔

سائنسی لحاظ سے مجھے اس بات سے پورا اتفاق ہے کہ پانی کی تین طبعی حالتیں ہوتی ہیں۔ ٹھوس، مائع اور گیس یا برف، پانی اور بخارات۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ اپنے اجزا کے لحاظ سے یہ ایک ہی چیز رہتی ہے۔ پانی کا کیمیائی فارمولا H_2O ہے یعنی دو ایٹم ہائیڈروجن کے اور ایک ایٹم آکسیجن کا۔ یہ اجزا اسی طرح رہتے ہیں، ان کا تناسب یہی رہتا ہے صرف طبعی حالت تبدیل ہوتی ہے۔

اب ہم عقیدۂ تثلیث کا جائزہ لیتے ہیں۔ باپ، بیٹا اور روح القدس۔ کیا یہاں بھی صرف حالت ہی تبدیل ہوتی ہے؟ چلیے ہم مان لیتے ہیں کہ یہاں بھی صرف حالت کا فرق

پڑتا ہے، کیا یہاں بھی اجزا وہی رہتے ہیں؟

باپ اور روح القدس کا وجود روحانی ہے جب کہ انسان گوشت پوست کی مخلوق ہے۔ انسان کو زندہ رہنے کے لیے کھانے پینے کی ضرورت ہوتی ہے جب کہ خدا ان ضرورتوں سے پاک ہے۔ دونوں مختلف ہیں دونوں ایک جیسے کس طرح ہو سکتے ہیں؟

اور یہ بات خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بیان سے بھی ثابت ہوتی ہے، وہ لوقا کی انجیل میں فرماتے ہیں:

''اس نے ان سے کہا ''تم کیوں گھبراتے ہو؟ اور کس واسطے تمہارے دل میں شک پیدا ہوتے ہیں؟ میرے ہاتھ اور میرے پاؤں دیکھو کہ میں وہی ہوں۔ مجھے چھو کر دیکھو کیوں کہ روح کے گوشت اور ہڈی نہیں ہوتی جیسا کہ مجھ میں دیکھتے ہو، یہ کہہ کر اس نے انھیں اپنے ہاتھ اور پاؤں دکھائے۔ جب مارے خوشی کے ان کو یقین نہ آیا اور تعجب کرتے تھے تو اس نے ان سے کہا کیا یہاں تمہارے پاس کھانے کو کچھ ہے؟ انہوں نے اسے بھنی ہوئی مچھلی کا قتلہ دیا۔ اس نے لے کر ان کے روبرو کھایا۔''

حضرت عیسیٰ علیہ السلام یہاں خود فرما رہے ہیں کہ روح گوشت اور ہڈیاں نہیں رکھتی۔ سائنسی طور پر یہ بات ثابت کرنے کے لیے کہ وہ خدا نہیں ہیں، انھوں نے ان کے روبرو مچھلی کا ٹکڑا کھایا اور اس طرح باپ بیٹے اور روح القدس کے ایک ہونے یعنی تثلیث کے عقیدے کو خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے رد کر دیا۔

پوری بائبل میں تثلیث (Trinity) کا لفظ ہی موجود نہیں ہے۔ لیکن قرآن میں اس کا ذکر موجود ہے۔

سورۂ نسا میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَلَا تَقُولُوا ثَلٰثَةٌ اِنْتَهُوا خَيْرًا لَّكُمْ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ﴾

[النساء: ۱۷۱]

''اور نہ کہو کہ تین ہیں۔ باز آ جاؤ یہ تمہارے ہی لیے بہتر ہے۔ اللہ تو بس ایک ہی خدا ہے۔''

سورۂ مائدہ میں پھر ارشاد ہوتا ہے:

﴿لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ وَ مَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّاۤ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَ اِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝﴾ [المائدہ: ۷۳]

''یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنھوں نے کہا کہ اللہ تین میں کا ایک ہے۔ حالاں کہ ایک خدا کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔ اگر یہ لوگ اپنی ان باتوں سے باز نہ آئے تو ان میں سے جس جس نے کفر کیا ہے، اس کو دردناک سزا دی جائے گی۔''

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ خدا ہیں۔ بائبل میں بھی تثلیث کا تصور موجود نہیں ہے۔

واحد بیان جو تثلیث کے قریب ترین ہو سکتا ہے، یہ ہے:

''اور جو گواہی دیتا ہے وہ روح ہے کیوں کہ روح سچائی ہے۔ اور گواہی دینے والے تین ہیں، روح، پانی اور خون۔ اور یہ تینوں ایک ہی بات پر متفق ہیں۔''

[یوحنا کا پہلا خط۔ باب ۵۔ ۷]

اور اس آیت کے بارے میں بائبل کے Revised Standard Version میں یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ یہ آیت الحاقی ہے۔ یعنی اسے بائبل سے نکال ہی دیا گیا ہے، گویا حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کبھی دعویٰ الوہیت نہیں کیا۔

پوری بائبل میں کوئی ایک بیان بھی ایسا موجود نہیں جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا ہو کہ میں خدا ہوں۔ یا یہ کہا ہو کہ میری عبادت کرو۔ بلکہ اگر آپ بائبل کا مطالعہ کریں تو آپ کو اس قسم کی آیات ملیں گی:

''اگر تم مجھ سے محبت رکھتے تو اس بات سے کہ میں باپ کے پاس جاتا ہوں

خوش ہوتے کیوں کہ باپ مجھ سے بڑا ہے۔'' [یوحنا۔ باب ۱۴۔ ۲۸]

''میرا باپ سب سے بڑا ہے۔'' [یوحنا۔ باب ۱۰۔ ۲۹]

''میں خدا کی روح کی مدد سے بدروحوں کو نکالتا ہوں۔'' [متی۔ باب ۱۲۔ ۲۹]

''میں بدروحوں کو خدا کی قدرت سے نکالتا ہوں۔'' [لوقا۔ باب ۱۱۔ ۲۲]

''میں اپنے آپ سے کچھ نہیں کرسکتا۔'' [یوحنا۔ باب ۵۔ ۳۰]

حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرما رہے ہیں کہ میں اپنے آپ سے کچھ نہیں کرسکتا۔ یعنی جو کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کی مرضی سے کرتا ہوں۔ اور یہی اسلامی عقیدہ ہے۔ مسلمان ہوتا ہی وہ ہے جو اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی کے تابع کردے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مسلمان تھے اور اللہ تعالیٰ کے عظیم پیغمبروں میں سے ایک تھے۔

ہمارا ایمان ہے کہ ان کی پیدائش ایک معجزہ تھا۔ ہمارا ایمان ہے کہ وہ اللہ کے حکم سے مردوں کو زندہ کر دیتے تھے، اندھوں اور کوڑھیوں کو ٹھیک کر دیتے تھے۔ ہم ایک عظیم الشان پیغمبر کے ہونے کی حیثیت سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا احترام کرتے ہیں۔ لیکن وہ خدا نہیں ہیں۔ قرآن کہتا ہے:

﴿هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾

سوال:...... ڈاکٹر ولیم کیمپبل، کیا آج کی گفتگو کے بعد آپ کو کوئی فایدہ ہوا ہے؟ کیا اسلام کی حقانیت کی جانب آپ کو کوئی اشارہ ملا ہے؟

ڈاکٹر ولیم کیمپبل:...... دیکھیے، میں گزشتہ سوال کو آپ کے سوال کا جواب دینے کے لیے استعمال کروں گا۔ ڈاکٹر نائیک کہتے ہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے کہیں یہ نہیں کہا کہ وہ خدا ہیں۔ حالاں کہ مرقس کی انجیل میں ارشاد ہوتا ہے:

''سردار کاہن نے اس سے پھر سوال کیا اور کہا کیا تو اس ستودہ کا بیٹا مسیح ہے؟ یسوع نے کہا ہاں میں ہوں اور تم ابن آدم کو قادر مطلق کے دائیں طرف بیٹھے آسمان کے بادلوں کے ساتھ آتے دیکھو گے۔'' [مرقس۔ باب ۵۔ ۶۱]

یہاں وہ خود کو واضح طور پر خدا کا بیٹا اور الوہی قرار دے رہے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر ذاکر نائیک صرف انھی آیات کا حوالہ دے رہے ہیں جن کا حوالہ وہ دینا چاہتے ہیں۔ یعنی جن آیات میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بشری پہلو کا ذکر ہے۔ لیکن دیگر آیات میں وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ میں اور باپ ایک ہی ہیں۔

خدا گوشت پوست کی صورت اختیار کر کے ہمارے بیچ رہا......... رہا میرے دوست کا سوال کہ کیا میں نے آج کی گفتگو سے کچھ سیکھا ہے؟ تو یقیناً ہم نے کئی باتیں سیکھی ہیں، اور میں ہمیشہ سیکھنے کے لیے تیار رہتا ہوں۔ لیکن میرا خیال یہی ہے کہ جن پانچ سو گواہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مرنے کے بعد زندہ ہوتے ہوئے دیکھا تھا، ان کی گواہی میرے لیے زیادہ مضبوط ہے بہ نسبت چھ سو سال بعد آنے والے محمدؐ کی تنہا گواہی کے۔

سوال:...... ڈاکٹر ذاکر، اپنی گفتگو کے دوران ڈاکٹر کیمپبل نے قرآن کے تصورِ کائنات کے حوالے سے کچھ غلط باتیں کیں، جن کا جواب آپ نے دیا۔ لیکن بائبل جو کچھ زمین کی ساخت وغیرہ کے بارے میں کہتی ہے اس کا ذکر آپ نے نہیں کیا؟

ڈاکٹر ذاکر نائیک:...... بہن نے پوچھا ہے کہ میں نے اس بارے میں کوئی گفتگو نہیں کی کہ بائبل زمین کی ساخت کے بارے میں کیا کہتی ہے؟ میرے پاس وقت محدود تھا۔ میں ایسے سو نکات مزید بیان کر سکتا ہوں جنھیں میں نے وقت کی کمی کی وجہ سے نہیں چھیڑا۔

بہر حال بہن جاننا چاہتی ہے کہ بائبل زمین کی ساخت کے بارے میں کیا کہتی ہے۔ بائبل میں کہا گیا ہے:

> ''پھر ابلیس اسے ایک بہت اونچے پہاڑ پر لے گیا اور دنیا کی سب سلطنتیں اور ان کی شان و شوکت اسے دکھائی۔'' [متی۔ باب ۴۔ ۸]

اب بات یہ ہے کہ آپ دنیا کے بلند ترین پہاڑ پر ہی کیوں نہ چلے جائیں۔ آپ ماؤنٹ ایورسٹ کی چوٹی پر ہی کیوں نہ چلے جائیں اور فرض کیجیے آپ بہت دُور تک دیکھ بھی

سکتے ہوں، ہزاروں میل تک دیکھ سکتے ہوں، پھر بھی آپ دنیا کی تمام سلطنتیں نہیں دیکھ سکتے۔ کیوں کہ آدھی دنیا زمین کے دوسری طرف ہوگی۔ کسی اونچے مقام سے پوری دنیا کو دیکھنا صرف اسی صورت میں ممکن ہے اگر زمین چپٹی ہو۔ اور یہی بائبل بتاتی ہے کہ زمین چپٹی ہے۔ پھر زمین کے بارے میں اسی طرح کا بیان بائبل میں ایک اور جگہ بھی موجود ہے:

''میں نے نگاہ کی اور کیا دیکھتا ہوں کہ زمین کے وسط میں ایک نہایت اونچا درخت ہے۔ وہ درخت بڑھا اور مضبوط ہوا اور اس کی چوٹی آسمان تک پہنچی اور وہ زمین کی انتہا تک دکھائی دینے لگا۔'' [دانی ایل۔ باب ۴۔ ۱۰]

مندرجہ بالا صورتِ حال بھی صرف اسی صورت میں ممکن ہے اگر زمین چپٹی ہو۔ کیوں کہ اگر زمین گول ہے تو پھر زمین کی دوسری طرف سے اس درخت کو کبھی نہیں دیکھا جا سکے گا۔

لیکن آج یہ بات ایک طے شدہ حقیقت کا درجہ رکھتی ہے کہ زمین گول ہے۔ مزید برآں تواریخ۔ ۱، باب ۱۶، آیت ۳۰ میں کہا گیا ہے کہ:

''جہان قایم ہے اور اسے جنبش نہیں۔''

یہ بات بائبل میں دوسری جگہ بھی کی گئی ہے کہ زمین حرکت نہیں کرتی۔

ایک بات ڈاکٹر کیمپبل کے اس بیان کے حوالے سے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے یہ کہا ہے کہ میں خدا ہوں۔ آپ میری کتاب ''مذاہب عالم میں تصور خدا'' (1) میں تمام حوالہ جات ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ جو حوالے ڈاکٹر کیمپبل نے دیے ہیں انھی کو سیاق و سباق میں رکھ کر دیکھا جائے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کبھی ایسا دعویٰ نہیں کیا۔

سوال:...... ڈاکٹر ذاکر نائیک صاحب! آپ کہتے ہیں کہ قرآن میں کوئی غلطی نہیں ہے۔ میں گرامر کی ۲۰ غلطیاں دکھا سکتا ہوں، مثال کے طور پر سوہ بقرہ میں، سورۂ حج میں، سورہ طٰہٰ میں، کیا آپ ان غلطیوں کی وضاحت کر سکتے ہیں؟

ڈاکٹر ذاکر نائیک:...... بھائی نے بڑا اچھا سوال پوچھا ہے۔ انھوں نے

---

(1) ناشر دار النوادر، اُردو بازار، لاہور

قرآن میں گرامر کی بیس غلطیوں کی بات کی ہے۔ جس کتاب کے حوالے سے وہ بات کر رہے ہیں وہ عبدالفادی کی کتاب ہے ''Is Quran Infalbible'' میں ان ۲۰ غلطیوں کی وضاحت اکٹھی ہی کر دوں گا۔ میں یہ کتاب بھی پڑھ چکا ہوں اور میرے بھائی میں ان سب غلطیوں کا جواب دیتا ہوں۔

پہلی بات تو سمجھنے کی یہ ہے کہ عربی زبان کی تمام تر گرامر لی ہی قرآن سے گئی ہے۔ قرآن عربی زبان وادب کا اعلیٰ ترین معیار اور حوالہ ہے۔ عربی گرامر کی نصابی کتاب ہی قرآن مجید ہے۔ جب قرآن ہی نصاب ہے اور قرآن ہی سے گرامر اخذ کی گئی ہے تو صاف ظاہر ہے کہ گرامر کی کوئی غلطی قرآن میں ہو ہی نہیں سکتی۔

آپ کے پاس پیمائش کے لیے ایک آلہ ہے۔ اسی آلے سے پیمائش کر کے آپ نے صحیح اور غلط کا فیصلہ کرنا ہے۔ اس پیمانے کو آپ کس طرح غلط کہہ سکتے ہیں۔ یہ غیر منطقی بات ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ مختلف عرب قبائل کی زبان میں فرق موجود ہے۔ ڈاکٹر ولیم بھی جانتے ہوں گے کہ زبان میں تبدیلی مختلف قبائل کے لحاظ سے ہوتی ہے۔ ایک لفظ کو ایک قبیلہ مونث سمجھتا ہے تو دوسرے لوگ اسے مذکر قرار دیتے ہیں۔ تذکیر و تانیث کا اختلاف بھی موجود ہے اور گرامر کا بھی۔

اس صورتِ حال میں آپ ان عرب قبائل کی زبان اور گرامر کو معیار بنا کر قرآن کی زبان کے بارے میں کوئی فیصلہ کس طرح صادر کر سکتے ہیں؟ قرآن کا معیارِ فصاحت و بلاغت اتنا بلند ہے کہ قرآن پر کوئی اعتراض اس حوالے سے ہو ہی نہیں سکتا۔

کیا آپ جانتے ہیں، اس حوالے سے متعدد کتابیں موجود ہیں۔ انٹرنیٹ پر کوئی بارہ غلطیاں گنوا رہا ہے اور کوئی بیس غلطیاں۔ آپ کا کیا خیال ہے، یہ غلطیاں تلاش کرنے والے کون ہیں؟ کیا یہ غیر مسلم ہیں؟ نہیں یہ مسلمان ہی ہیں۔ زامک شریف جیسے لوگ۔ یہ لوگ کرتے کیا ہیں۔ یہ جانتے ہیں کہ قرآن کا معیار اس قدر بلند ہے کہ بعض اوقات قرآن

گرامر کے عام اُصولوں سے بلند ہو کر بات کرتا ہے۔ اور قرآن کے اسی بلند معیار کو ثابت کرنے کے لیے ایسی مثالیں علما پیش کرتے ہیں۔

انھی مثالوں کو بعض لوگ غلطیاں بنا کر پیش کر دیتے ہیں۔ میں ایک مثال آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں اور آپ کو بیس کی بیس غلطیوں کا جواب مل جائے گا۔

حضرت لوط علیہ السلام کے حوالے سے کہا گیا ہے کہ انھوں نے پیغمبروں کا انکار کیا، اسی طرح حضرت نوح علیہ السلام کے حوالے سے بھی کہا گیا ہے کہ انھوں نے پیغمبروں کا انکار کیا لیکن ہم جانتے ہیں کہ ان اقوام کی طرف ایک ایک پیغمبر کو مبعوث کیا گیا تھا۔ کیا قرآن کو واحد کا صیغہ استعمال کرنا چاہیے تھا۔ ایک عام آدمی کے لحاظ سے یہ بھی گرامر کی غلطی ہے لیکن جو لوگ عربی ادب سے آشنا ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہی قرآنی اسلوب کا حُسن ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ تمام انبیائے کرام کا بنیادی پیغام ایک ہی تھا۔ لہٰذا ایک کا انکار درحقیقت سب کا انکار ہے۔

آپ نے قرآن کی بلاغت اور حسن ملاحظہ فرمایا۔ کوئی کہتا رہے کہ یہ غلطی ہے لیکن یہ غلطی ہرگز نہیں ہے۔

اسی طرح انیس شورش جیسے لوگ کہتے ہیں کہ "کن فیکون" غلط ہے کیونکہ صیغہ ماضی کے لحاظ سے کن فکان ہونا چاہیے۔ لیکن یہاں بھی وہ قرآنی بیان کے حُسن کو نہیں سمجھ پائے۔ یہاں جان بوجھ کر ماضی کا صیغہ نہیں استعمال کیا گیا، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے ماضی میں ایسا کیا اور وہ حال اور مستقبل میں بھی ایسا کر سکتا ہے۔

سوال:...... ڈاکٹر کیمپبل، اپنی گفتگو کی ابتدا میں آپ نے فرمایا کہ ذوالقرنین، سکندر اعظم تھا۔ کیا آپ بتائیں گے کہ آپ کو کس طرح معلوم ہوا کہ ذوالقرنین دراصل سکندر اعظم تھا؟

ڈاکٹر ولیم کیمپبل:...... میں نے یہ بات عبداللہ یوسف علی کے ترجمہ قرآن کے حواشی میں پڑھی تھی۔ لیکن اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ذوالقرنین اصل میں سکندر اعظم ہی تھا یا کوئی اور۔ اصل بات یہ ہے کہ سورج گدلے پانی میں نہیں ڈوبتا جب کہ قرآن

کی آیت یہی کہہ رہی ہے۔

سوال:...... بائبل میں کہا گیا ہے کہ یونس علیہ السلام تین دن اور تین رات مچھلی کے پیٹ میں رہے تھے، اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام تین دن اور تین رات زمین کے پیٹ میں رہیں گے، کیا یہ پیش گوئی پوری ہوئی؟

ڈاکٹر ذاکر نائیک:...... بہن جس آیت کا حوالہ دے رہی ہے وہ متی کی انجیل کے بارھویں باب میں ہے:

”اس پر بعض فقیہوں اور فریسیوں نے جواب میں اس سے کہا کہ اے استاد ہم تجھ سے ایک نشان دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس نے جواب دے کر ان سے کہا اس زمانہ کے بُرے اور زنا کار لوگ نشان طلب کرتے ہیں مگر یوناہ نبی کے نشان کے علاوہ کوئی اور نشان ان کو نہ دیا جائے گا۔ کیوں کہ جیسے یوناہ تین رات دن مچھلی کے پیٹ میں رہا ویسے ہی ابن آدم تین رات دن زمین کے اندر رہے گا۔“

دیکھیے اس پیش گوئی میں واضح طور پر حضرت یونس علیہ السلام کی مثال دی گئی ہے کہ جس طرح وہ تین راتیں اور تین دن مچھلی کے پیٹ میں رہے، اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام تین راتیں اور تین دن زمین کے پیٹ میں رہیں گے لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مصلوب ہونے کی جو داستان ہمیں بائبل سناتی ہے اس کے مطابق تو انھیں جمعہ کے دن مصلوب کیا گیا۔ رات گئے دفن کیا گیا اور اتوار کو قبر خالی تھی۔ یہ دو دن بھی نہیں بنتے بلکہ زیادہ سے زیادہ ایک دن اور دو راتیں بنتی ہیں۔ تین دن اور تین راتیں نہیں۔

ڈاکٹر ولیم اپنی کتاب میں اس بات کا جواب دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ دن کے ایک حصے کو پورا دن شمار کیا جا سکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر ایک مریض ہفتے کی شب بیمار ہوا ہو، اگر پیر کے دن میں اس سے پوچھوں کہ وہ کتنے دن سے بیمار ہے تو وہ یہی جواب دے گا کہ تین دن سے۔

ہم ان کی بات مان لیتے ہیں۔ ٹھیک ہے۔ اسی طرح ہو گا۔ لیکن پیر کے دن کوئی

مریض یہ ہرگز نہیں کہے گا کہ تین دن اور تین راتیں۔ میں چیلنج کرتا ہوں۔ میں نے الحمدللہ بہت مریض دیکھے ہیں اور ان میں مسیحی مریض بھی شامل تھے۔ لیکن کسی بھی مریض نے جو گزشتہ پرسوں رات کو بیمار ہوا ہو یہ کبھی نہیں کہا کہ میں تین دنوں اور تین راتوں سے بیمار ہوں۔ جب کہ بائبل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرما رہے ہیں تین دن اور تین راتیں۔ لہٰذا یہ ایک ریاضیاتی غلطی ہے۔

سائنسی لحاظ سے تقابل حضرت یونس علیہ السلام کے ساتھ کیا جائے تو یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ وہ تین دن مچھلی کے پیٹ میں کیسے رہے؟ زندہ یا مردہ؟ جواب ہوگا زندہ۔ مچھلی تین دن انہیں زندہ لے کر سمندر میں پھرتی رہی۔ وہ زندہ تھے، جب انھوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائی۔ جب مچھلی نے انھیں ساحل پر اُگلا تو وہ زندہ تھے۔ زندہ، زندہ، زندہ۔

لیکن جب پوچھا جائے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تین دن زمین میں کیسے رہے تو جواب کیا ہوگا؟ زندہ یا مردہ؟

اگر وہ مردہ تھے تو پیش گوئی پوری نہیں ہوئی، اگر زندہ تھے تو پھر وہ مصلوب ہی نہیں ہوئے۔ میں اپنے ایک خطاب میں اس موضوع پر گفتگو کر چکا ہوں کہ حضرت مسیح علیہ السلام مصلوب ہوئے تھے یا نہیں؟ اور درست بات وہی ہے جو قرآن بتاتا ہے یعنی:

﴿وَ مَا قَتَلُوْهُ وَ مَا صَلَبُوْهُ وَ لٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ﴾ [النساء: ۱۵۷]

”حالانکہ فی الواقع انھوں نے نہ اس کو قتل کیا اور نہ صلیب پر چڑھایا۔ بلکہ معاملہ ان کے لیے مشتبہ کر دیا گیا۔“

سوال:......ڈاکٹر ولیم کیمپبل، آپ ایک ڈاکٹر ہیں، کیا آپ بائبل کے طبی بیانات کی وضاحت کریں گے، کیوں کہ آپ نے اپنے جوابی خطاب میں ان چیزوں کا جواب نہیں دیا۔ مثال کے طور پر خون کا جراثیم کش کے طور پر استعمال؟ یا بیٹی کی پیدائش کی صورت میں عورت کا دگنے عرصے تک ناپاک رہنا؟

ڈاکٹر ولیم کیمپبل:......شکریہ میں آپ کے سوال کی طرف آتا ہوں۔ لیکن

ہو یہ رہا ہے کہ ڈاکٹر ذاکر نائیک سے وہ سوالات کیے جا رہے ہیں جو ایک مسیحی سے کیے جانے چاہئیں۔ بائبل کا اگر آپ مطالعہ کریں تو اس میں تین دن اور تیسرے دن کے الفاظ مترادفات کے طور پر استعمال ہوئے ہیں۔ جہاں تک میرا خیال ہے ان تمام الفاظ کا ایک ہی مطلب ہے۔

دوسری بات یہ کہ جب جمعرات کے دن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو گرفتار کیا گیا تو انھوں نے کہا کہ میرا وقت آ چکا ہے۔ لہٰذا میں تین دن اور تین رات کو اس وقت سے گنتا ہوں۔

یہ میرا کام نہیں کہ وضاحت کروں کہ خدا نے ان آیات میں کیا کہا ہے لیکن یہ میرا ایمان ہے کہ بائبل میں یہ باتیں خدا کی طرف سے ہیں۔

سوال:...... اسلام ہمیں ارتقا کے بارے میں کیا بتاتا ہے؟

ڈاکٹر ذاکر نائیک:...... اس سوال کے مکمل جواب کے لیے آپ میری کتاب ''قرآن اور سائنس'' [1] سے رجوع کر سکتے ہیں۔ جب آپ ڈارون کے نظریہ ارتقا کے حوالے سے بات کرتے ہیں تو ڈارون کا معاملہ یہ ہے کہ وہ ایک جہاز میں، جس کا نام ایچ، ایم، ایچ بیگل تھا، ایک سفر پر نکلا، جزائر میں گیا، وہاں اس نے مشاہدات کیے اور اس کے نتیجے میں قدرتی چناؤ کا نظریہ وضع کیا۔

لیکن اس نے اپنے ایک دوست تھامس تھامپٹن کو ایک خط لکھا جس میں اس نے کہا کہ میں ''قدرتی چناؤ کے نظریے کے لیے کوئی ثبوت فراہم نہیں کر سکتا لیکن چوں کہ اس سے مجھے مدد ملتی ہے لہٰذا میں نے اسے اپنا لیا ہے۔''

ڈارون کا نظریہ محض ایک نظریہ ہے، کوئی ثابت شدہ حقیقت نہیں ہے۔ اور میں نے اپنی گفتگو کی ابتدا میں یہ بات واضح کر دی تھی کہ قرآن نظریات اور مفروضوں کے خلاف تو ہو سکتا ہے، کیوں کہ یہ نظریات بعض اوقات بالکل ہی اُلٹے ہو جایا کرتے ہیں، لیکن آپ قرآن اور کسی ثابت شدہ حقیقت میں کوئی اختلاف نہیں پائیں گے۔

---

[1] ناشر دار النوادر، اُردو بازار، لاہور

ہمارے سکولوں میں ڈارون کا نظریہ اس طرح پڑھایا جا رہا ہے جیسے یہ کوئی ثابت شدہ حقیقت ہو، حالاں کہ یہ نظریہ ہرگز ثابت شدہ نہیں۔ اس کا کوئی سائنسی ثبوت موجود نہیں اور پھر یہ کہ بہت سی کڑیاں گم شدہ ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ہم نے کسی دوست سے مذاق کرنا ہو یا اس کی تضحیک کرنی ہو تو کہتے ہیں کہ ''اگر تم ڈارون کے وقت میں ہوتے تو اس کا نظریہ درست ثابت ہو جاتا۔'' جس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ بندر نما ہے۔

میں ان چاروں طرح کے فوسلز کے بارے میں جانتا ہوں جو دستیاب ہیں لیکن اس کے باوجود کئی کڑیاں گم شدہ ہیں۔

حیاتیات کے بارے میں قرآن ہمیں بتاتا ہے:

﴿وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ﴾ [الانبیاء: ۳۰]

''اور (ہم نے) پانی سے ہر زندہ چیز پیدا کی۔''

آج ہم جانتے ہیں کہ ہر زندہ مخلوق کی بنیادی اکائی خلیہ ہے اور خلیہ بیش تر سائٹوپلازم پر مشتمل ہوتا ہے جو کہ تقریباً نوے فی صد پانی ہوتا ہے۔ ہر زندہ مخلوق پچاس فی صد سے نوے فی صد پانی پر مشتمل ہوتی ہے۔ کیا عرب کے صحراؤں میں کسی کو یہ اندازہ ہو سکتا تھا یا ایسا خیال بھی آ سکتا تھا کہ ہر زندہ چیز پانی سے بنی ہے۔

اور قرآن یہ حقیقت ۱۴۰۰ برس پہلے بیان کر چکا ہے۔

سوال:...... اگر ڈاکٹر کیمپبل بائبل میں موجود تضادات کی وضاحت نہیں کر سکتے تو کیا انھیں تسلیم نہیں کر لینا چاہیے کہ بائبل غیر سائنسی ہے اور منجانب اللہ نہیں ہے؟

ڈاکٹر ولیم کیمپبل:...... میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس حوالے سے مجھے کچھ مسائل درپیش ہیں لیکن میرا ایمان ہے کہ رسولوں کی پیش گوئیاں درست ہیں۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی اصل بنیاد ہیں جن کے گرد یہ ساری عمارت تعمیر ہوئی ہے۔ حواریوں نے یہ انجیلیں انھی پیش گوئیوں کے پورا ہونے پر تحریر کیں۔

میں جانتا ہوں کہ یہ آپ کے سوال کا جواب نہیں ہے۔ لیکن میرا ایمان حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ہے۔

سوال:...... کیا متن اور ترجمہ ایک ہی چیز ہے؟ اگر نہیں تو کیا موجودہ انگریزی بائبل وہی انجیل ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو عطا ہوئی تھی؟

ڈاکٹر ذاکر نائیک:...... ''متن'' اور ''ترجمہ'' دو مختلف الفاظ ہیں۔ جو دو مختلف معانی رکھتے ہیں، لہٰذا سائنسی طور پر آپ ایک متن اور اس کے ترجمے کو ایک ہی چیز نہیں قرار دے سکتے۔

کیا حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام پر وحی انگریزی زبان میں نازل ہوئی تھی؟ یہ ایک بہت اچھا سوال ہے کہ کیا متن اور ترجمہ ایک ہی چیز ہو سکتے ہیں؟ جواب ہے ''نہیں'' متن اور ترجمہ کبھی ایک چیز نہیں ہو سکتے۔ ترجمہ متن کے قریب ترین ہو سکتا ہے لیکن متن کا نعم البدل کبھی نہیں ہو سکتا۔

مولانا عبدالماجد دریا بادی نے کہا تھا کہ ترجمے کے لحاظ سے دنیا کی سب سے مشکل کتاب قرآن مجید ہے کیونکہ قرآن کی زبان اس قدر بلیغ ہے، اس قدر بلند ہے، اس قدر عظیم ہے کہ اس کا ترجمہ مشکل ترین کام ہے۔ ایک ایک لفظ کے متعدد معانی ہیں۔ اگر ترجمے میں کوئی غلطی ہو جاتی ہے تو یہ انسانی کام ہے لہٰذا وہ انسانی غلطی ہوگی۔ اور ترجمہ کرنے والا اس کے لیے موردِ الزام ہوگا نہ کہ اللہ تعالیٰ۔

بائبل انگریزی میں نازل نہیں ہوئی تھی۔ عہد نامہ قدیم عبرانی زبان میں تحریر ہوا تھا جب کہ عہد نامہ جدید یونانی زبان میں۔

اگرچہ عیسیٰ علیہ السلام عبرانی زبان بولتے تھے لیکن انجیل کا مسودہ یونانی زبان میں ہے۔ اصل عبرانی مسودہ دستیاب نہیں ہے۔ بلکہ کیا آپ جانتے ہیں کہ عہد نامہ قدیم کا عبرانی متن بھی دراصل یونانی زبان سے دوبارہ عبرانی ترجمہ ہے۔ یعنی عہد نامہ قدیم کا اصل عبرانی متن بھی دستیاب نہیں ہے۔ لہٰذا یہاں دوہرا مسئلہ ہے۔ چنانچہ اس بات پر حیرت نہیں ہونی چاہیے

کہ اس میں بہت سی اغلاط موجود ہیں۔

لیکن قرآن کا معاملہ الحمد للہ یہ ہے کہ اصل عربی متن ہی محفوظ ہے۔ آپ سائنسی طور پر ثابت کر سکتے ہیں کہ یہ اصل متن ہے۔

لیکن ہمارا یقین اسی بات پر ہے جو قرآن میں کر دی گئی ہے:

﴿وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ﴾ [الرعد: ۳۸]

''تم سے پہلے بھی ہم بہت سے رسول بھیج چکے ہیں۔''

ان رسولوں پر کتابیں بھی نازل ہوئی تھیں۔ جن میں سے چار کے ناموں کا بھی ذکر کیا گیا ہے یعنی توراۃ، زبور، انجیل اور قرآن۔ توراۃ سے مراد وہ وحی ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی۔ زبور حضرت داؤد علیہ السلام پر، انجیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر جب کہ قرآن حضرت محمد ﷺ پر۔ لیکن موجودہ بائبل ہرگز وہ انجیل نہیں ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی۔

سوال:...... کیا موجودہ بائبل وہی انجیل ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی؟

ڈاکٹر ولیم کیمپبل:...... موجودہ انجیل وہی ہے جو ہمیشہ سے تھی۔ ہمارے پاس متون موجود ہیں۔ ۷۵ فی صد متن تو ایسا ہے جو ۱۸۰ء سے موجود ہے۔ یعنی تحریر کیے جانے کے تقریباً سو برس بعد کے وقت سے یہ متن موجود ہیں۔ یوحنا نے اپنی زندگی میں یہ متن تحریر کیا۔ جب وہ متن تحریر کر رہے تھے تو اُس وقت کے بہت سے لوگ ابھی زندہ تھے۔ وہ اور ان کے باپ دادا یوحنا کے ذریعے ایمان لائے تھے۔ یہ متن کی صحت کا کافی ثبوت ہے۔ انجیل کی ایک مصدقہ تاریخ موجود ہے۔

باقی خدا ہر چیز پر قادر ہے .... جو چاہے کر سکتا ہے .... اس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو منتخب کیا .... اصل بات یہ ہے کہ پیش گوئیوں کے پورا ہونے کا کس قدر امکان تھا؟ شکریہ

سوال:...... سائنس تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ اگر قرآن اور سائنس میں اتنی ہی مطابقت ہے جتنی آپ بتا رہے ہیں تو پھر اس صورت میں کیا ہوگا، اگر سائنسی نظریات تبدیل

ہو جائیں؟

ڈاکٹر ذاکر نائیک :...... سوال بہت اہم ہے، کہ قرآن اور جدید سائنس کے درمیان مطابقت ثابت کرنے کے لیے اتنی محنت کی جاتی ہے۔ اگر جدید سائنس غلط ثابت ہو جائے تو پھر کیا ہوگا؟ کیا سائنس میں ہونے والی تبدیلیوں کے لحاظ سے قرآن بھی بدل جاتا ہے۔ یہ ایک بہت اچھا سوال ہے۔ اور قرآن کی مطابقت جدید سائنس کے ساتھ ثابت کرتے ہوئے ہمیں بہت احتیاط سے کام لینا چاہیے۔

اسی لیے میں نے اپنی گفتگو کے آغاز میں ہی یہ بات واضح کر دی تھی کہ صرف اور صرف مصدقہ حقائق کے بارے میں ہی بات کروں گا، سائنسی نظریات اور مفروضوں کے بارے میں نہیں۔ کیوں کہ مصدقہ حقائق، ثابت شدہ حقائق تبدیل نہیں ہوتے۔ مثال کے طور پر یہ حقیقت کہ دنیا گول ہے۔ ثابت شدہ حقائق یوٹرن نہیں لیتے۔ لیکن غیر ثابت شدہ، غیر مصدقہ نظریات کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ وہ یوٹرن بھی لے سکتے ہیں۔

میں ایسے علما کے بارے میں بھی جانتا ہوں جو ڈارون کے نظریہ ارتقا کا ثبوت قرآن سے دینے کی کوشش کرتے ہیں، اور ظاہر ہے کہ یہ ایک نامعقول بات ہے۔ لہٰذا ہمیں یہ رویہ قطعاً نہیں اپنانا چاہیے کہ ہر چیز کو، جدید سائنس کے ہر نظریے کو قرآن سے ثابت کرنے کی کوشش شروع کر دیں۔ ہمیں پہلے دیکھنا چاہیے کہ نظریے کی حیثیت ایک ثابت شدہ حقیقت کی ہے یا محض مفروضے کی۔ مفروضہ درست بھی ہو سکتا ہے اور غلط بھی۔

مثال کے طور پر بگ بینگ کے نظریے (Big Bang Theory) ہی کو دیکھیے۔ آج اس کی حیثیت کی حقیقت کیا ہے لیکن کل یہ محض ایک مفروضہ تھا۔ جب مفروضہ حقیقت میں تبدیل ہو جاتا ہے تو پھر ہم اسے استعمال کر سکتے ہیں۔

آپ جانتے ہیں کہ ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ نسل انسانی کا ارتقا جینز کے ایک جوڑے سے ہوا ہے اور جینز ہی آدم وحوا تھے۔ لیکن میں اس نظریے کو کبھی اپنی گفتگو میں زیر بحث نہیں لاتا کیونکہ یہ نظریہ ابھی تک محتاج ثبوت ہے۔

چنانچہ قرآن اور سائنس کی مطابقت کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے یہ بات ہمیشہ پیش نظر رہنی چاہیے کہ آپ مصدقہ حقائق کی بنیاد پر گفتگو کریں مفروضوں کی بنیاد پر نہیں۔

قرآن سائنس سے بدر جہا برتر ہے۔ لہٰذا جدید سائنس کے ذریعے قرآن کی حقانیت ثابت کرنے کی کوشش نہیں کر رہا۔ قرآن کے منزل من اللہ ہونے کا ثبوت جدید سائنس سے فراہم نہیں کر رہا، ہرگز نہیں۔ بلکہ میں تو صرف یہ کرتا ہوں کہ چونکہ ایک مسلمان کے برعکس ایک غیر مسلم اور دہریے کے لیے شاید اصل معیار جدید سائنس ہو لہٰذا میں انھی کے معیار، انھی کے پیمانے کو استعمال کرتے ہوئے قرآن کی برتری کا ثبوت فراہم کرتا ہوں، تا کہ وہ قرآن پر ایمان لائیں۔

سوال:...... اگر ڈاکٹر کیمپبل ان اعتراضات کا جواب دینے سے معذور ہیں جو ڈاکٹر ذاکر نائیک نے پیش کیے ہیں تو کیا وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ بائبل میں اغلاط موجود ہیں؟

ڈاکٹر ولیم کیمپبل:...... یہ وہی سوال ہے جو پہلے بھی پوچھا جا چکا ہے۔ بات یہ ہے کہ بائبل میں کچھ چیزیں ایسی ہیں جن کی وضاحت کرنا میرے لیے ممکن نہیں۔ میں فوری طور پر ان باتوں کا جواب نہیں دے سکتا لیکن میں انتظار کرنے کے لیے تیار ہوں۔ ہو سکتا ہے مجھے ان باتوں کا جواب مل جائے۔ بہت سی باتوں کے حوالے سے بائبل کی حقانیت آثارِ قدیمہ کی دریافت سے ثابت ہوئی ہے۔ یعنی علاقوں اور بادشاہوں وغیرہ کے حوالے سے بائبل کے بیانات کی حقانیت ثابت ہوئی ہے اور یہ بائبل کی صداقت کا ایک بہترین ثبوت ہے۔

سوال:...... کیا بائبل اور قرآن میں تضادات موجود ہیں؟

ڈاکٹر ذاکر نائیک:...... اس سوال کی مجھے مکمل طور پر سمجھ تو نہیں آئی۔ آپ قرآن کے بارے میں پوچھنا چاہتے ہیں یا بائبل کے بارے میں؟ بہر حال میں دونوں سوالات کا جواب دے دیتا ہوں۔

جہاں تک قرآن کا تعلق ہے، سورۂ نساء میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿أَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَ لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا﴾ [النساء: ۸۲]

''کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے؟ اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت کچھ اختلاف بیانی پائی جاتی۔''

لہٰذا قرآن میں تو تضاد کی کوئی ایک بھی مثال موجود نہیں ہے اور جہاں تک سوال ہے بائبل کا تو صورت یہ ہے کہ بائبل کے تضادات گنوانے کے لیے پانچ منٹ کا وقت بہت تھوڑا ہے۔ بلکہ اگر مجھے پانچ دن بھی دے دیے جائیں تو پھر بھی یہ وقت تھوڑا ہے..........!!

☆..........☆..........☆